مقالہ برائے ایم-اے علوم اسلامیہ

عبداللہ چکڑالوی کے تصور حدیث کا تنقیدی مطالعہ

مقالہ نگار

راشدہ مبارک

N-549589

03-PJG-1240

معرفت محمد اسلم ناصر

ٹویوٹا سرگودھا موٹرز

5 کلومیٹر لاہور روڈ سرگودھا

نگران مقالہ

ڈاکٹر عبدالحمید خان عباسی

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ قرآن وتفسیر

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

سیشن خزاں 2005ء

عبداللہ چکڑالوی کے تصورِ حدیث کا

تنقیدی مطالعہ

مقالہ برائے علوم اسلامیہ

موضوع مقالہ کی منظوری کا مراسلہ نمبر:

F. No. 60/2005/M.A/Islamic Thought

FORWORDING SHEET

The Thesis entitled عبداللہ چکڑالوی کے تصورِ حدیث کا تنقیدی مطالعہ Submitted by Rashida Mubarik in partial fulfillment of the rquirements for master's Degree in Islamic Studies has been completed under my guidance and Supervision. I am Satisfied with the quality of Student's research work and allowed her to Submit her thesis.

Signature

Dr. Abdul Hameed Khan Abbasi
Assistant Professor
Department of Quran & Tafseer
A.I.O.U
Islamabad

APPROVAL SHEET OF THE COMMITTEE

Title of thesis: عبداللہ چکڑالوی کے تصورحدیث کا تنقیدی مطالعہ

Name of Student: Rashida Mubarik

Accepted by the Department of Islamic Law, Faculty of Arabic & Islamic studies Allama Iqbal Open University, Islamabad partial fulfillment of the requirements for the degree of Master's in Islamic Studies Specialization in Hadith & Seerah.

Chairman department of Islamic studies

External Examiner ____________

Supervisor ____________

DECLARATION

I Rashida Mubarik Roll No. N549589 a Student of M.A Islamic Studies in Allama Iqbal Open University, Islamabad, do hereby solemnly declare that the thesis entitled عبداللہ چکڑالوی کے تصورِ حدیث کا تنقیدی مطالعہ is Submitted in Partial fullfilment of master's degree in Islamic Studies, is Original work and has not been Submitted or Published earlier and shall not in further be submitted by me for obtaining any degree from this or another University or institution.

Signature

Rashida Mubarik

Name Rashida Mubarik

فہرست موضوعات

انتساب

میری یہ تحقیقی کاوش اپنے

مشفق و مہربان والدین

کے نام

جن کی نیک تمنائیں

اور محبت بھری دعائیں

لمحہ بہ لمحہ میرے شامل حال رہیں

اظہارِ تشکر

میں اللہ تعالیٰ کی بہت شکرگزار ہوں جس نے مجھے ان تمام مراحل سے بڑی خوش اسلوبی سے گزار دیا اور دراصل اللہ تعالیٰ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد اور اس کا فضل ہے کہ میرا کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ میری اس حقیرسی کاوش کو بارآور فرمائے اور میری کوتاہیوں کو معاف فرمائے۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ہر کام میں کسی کی راہنمائی ضروری ہوتی ہے اور رہنمائی کے بغیر کام مکمل نہیں ہوسکتا۔

علمی کام اہل علم کے تعاون کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ ہر علمی کام کو مکمل کرنے کے لیے کسی خاص ماہر علم کے پرخلوص تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن شخصیات نے میری اس کاوش میں پرخلوص تعاون اور رہنمائی فرمائی میں اُن کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔ اس سلسلے میں میں اپنے نگران مقالہ ڈاکٹر عبدالحمید خان عباسی اور پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر خان خاکوانی ڈین کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ کی شکرگزار ہوں۔ ان کی مخلصانہ بےلوث رہنمائی، مشفقانہ رویہ اور حوصلہ افزائی سے میں منزل مقصود تک پہنچی۔ دوسرے تمام احباب کا جنہوں نے میرے اس کام میں میرے ساتھ تعاون کیا اور اپنے شریک حیات کی شکرگزار ہوں جن کی حوصلہ افزائی نے میری ہر مشکل کو آسان بنایا۔

مقدمہ

مقدمہ

موضوع تحقیق کا تعارف واہمیت

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے دو ذرائع عطا فرمائے: اول قرآن مجید، دوئم سنت وحدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ ہدایت کے ان ذرائع میں اولیت قرآن پاک کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے فرمائی۔ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقریرات ہیں۔

انکار حدیث کے فتنہ کا آغاز دوسری صدی ہجری میں ہوا۔ علماء حدیث نے اس فتنہ کے خلاف اس کے آغاز کے ساتھ ہی قلمی جہاد شروع کر دیا اور اس طرح اس ضمن میں ایک وقیع لٹریچر وجود میں آیا۔ اس لٹریچر کا اثر یہ ہوا کہ انکار حدیث کا فتنہ بڑی حد تک دب گیا۔

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں برصغیر میں کچھ علماء پیدا ہوئے جنہوں نے اس فتنہ کو از سر نو زندہ کر دیا۔ ان میں ایک اہم نام عبداللہ چکڑالوی کا بھی ہے۔ انہوں نے روایات پر مختلف پہلوؤں سے اعتراضات کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حدیث کا سارا ذخیرہ ناقابل اعتماد ہے۔ حجیت حدیث سے انکار کر دیا بلکہ اسے ''شرک فی کتاب اللہ'' قرار دینے لگے۔ حدیث نبوی نے تو امت کی رہنمائی اور اس کی وحدت وسالمیت کے تحفظ میں ہمیشہ مثبت اور بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ عبداللہ چکڑالوی کے اعتراضات کو زیر بحث لا کر ثابت کیا جائے کہ ان کے اعتراضات بے بنیاد اور کم علمی پر مبنی ہیں۔ موضوع کی اس اہمیت اور اس پر کام کرنے کی ضرورت کے پیش نظر ایم۔ اے علوم اسلامیہ تخصص فی الحدیث کے لئے اس موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے۔

موضوع کا بنیادی سوال

اس مقالہ کے بنیادی سوال کے اہم نکات یہ ہیں:

☆ حدیث سے کیا مراد ہے؟

☆ حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دین میں کیا حیثیت ہے؟

☆ کیا منکر حدیث اپنے اعتراضات میں حق بجانب ہے؟

☆ کیا عبداللہ چکڑالوی کا تصورِ حدیث مبنی بر حقیقت ہے؟

فرضیہ تحقیق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام فقط اللہ کا پیغام پہنچا دینا اور اس پیغام پر عمل کر کے بتانا ہی نہ تھا بلکہ اس کی تفصیل و توضیح بھی کرنا تھا۔ مگر یہ سب کچھ صرف ان کے اپنے زمانے تک کے لئے نہ تھا بلکہ آئندہ زمانوں کے لئے بھی تھا بلکہ رہتی دنیا تک کے لئے تھا۔

حدیث کی حجیت کے بارے میں ایک واضح نقطۂ نظر پیش کرنا، تاکہ منکرین حدیث نے احادیث کے ذخیرہ پر جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے ان کو رد کیا جائے۔

موضوع پر ہونے والے سابقہ کام کا جائزہ

معتزلہ کے دور میں جب انکار حدیث کی فکر عام ہونے لگی تو سب سے پہلے امام شافعیؒ نے اپنی کتاب "الرسالۃ" اور "کتاب الأم" کی ساتویں جلد میں اس کی تردید کی۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے بھی اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اثبات میں ایک جزو تصنیف کیا اور آیات و روایات سے مخالفین کی تردید کی۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "المستصفی" میں اور امام ابن حزم نے "الاحکام فی اصول الاحکام" میں اس کے خلاف مقالات لکھے۔ پھر اصول حدیث اور اصول فقہ کا یہ ایک مستقل موضوع بن گیا۔

انیسویں صدی میں برصغیر میں فرقہ اہل قرآن کے بانی عبداللہ چکڑالوی اور اس کے ہم خیال لوگوں نے حجیت حدیث سے انکار کر دیا اور یہ پروپیگنڈہ کیا کہ احادیث کا ذخیرہ نا قابل اعتماد اور نہ نا قابل استدلال ہے۔ اس فکر کے خلاف بھی علماء نے قلمی جہاد کیا اور بہت وقیع لٹریچر وجود میں آیا۔ موجودہ دور میں یہ فتنہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ اس گروہ کا ہدف پڑھا لکھا وہ طبقہ ہے جو عربی اور علوم اسلامیہ سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتا۔ دینی تربیت کا فقدان انہیں بڑی آسانی سے اس فکر کی راہ پر گامزن کر دیتا ہے۔

موجودہ کام کی افادیت

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی اور سرچشمۂ ہدایت ہے۔ حقیقت میں حدیث ہی اس آہنی ڈھانچے کی تکمیل کرتی ہے جس پر اسلام کے انفرادی و اجتماعی نظام حیات کی عمارت قائم ہے۔ عبداللہ چکڑالوی نے بہت سے مسائل میں سلف صالحین، صحابہ و تابعین اور جمہور مسلمانوں سے اختلاف کیا اور احادیث صحیح کو رد کیا۔ عبداللہ چکڑالوی نے فتنہ انکارِ حدیث کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ آج بھی یہ فتنہ موجود ہے۔ لہٰذا ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لکھا جائے تاکہ عام لوگ بھی اس فتنہ سے آگاہ ہوں۔ اسی ضرورت کے پیش نظر ''عبداللہ چکڑالوی کے تصور حدیث کا تنقیدی مطالعہ'' کو ایم۔اے علوم اسلامیہ کے مقالہ کے لئے موضوع تحقیق بنایا گیا ہے۔

اہداف تحقیق

موضوع تحقیق کے اہداف حسب ذیل ہیں:

۱- حدیث کا لغوی و اصطلاحی مفہوم بیان کرنا۔

۲- قرآن مجید کی نظر میں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام بیان کرنا۔

[illegible] ین اور ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کی نظر میں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام بیان کرنا۔

۴-حدیث کی اقسام اور حدیث کے بارے میں چند نظریات بیان کرنا۔

۵-فتنہ انکار حدیث اور برصغیر کے چند منکرین حدیث کا تعارف پیش کرنا۔

۶-عبداللہ چکڑالوی کے تصور حدیث پر تنقیدی بحث کرنا۔

اسلوبِ تحقیق

اس تحقیق کو مکمل کرنے کے لئے درج ذیل اسلوب تحقیق اختیار کیا گیا ہے:

قرآنی آیات اور تفسیر کی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

احادیث کی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اصلی مصادر سے مواد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بنیادی مصادر کے فراہم نہ ہونے کی صورت میں ثانوی ماخذ سے بھی رجوع کیا گیا ہے۔

انداز بیانیہ ہے۔

سادہ اور عام فہم زبان استعمال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

خاکہ تحقیق

زیر نظر مقالہ تین ابواب پر مشتمل ہے:

باب اوّل: حدیث کا تعارف اور اس کا مقام

فصل اوّل: حدیث و سنت کا مفہوم اور دونوں میں فرق

فصل دوم: قرآن کی نظر میں حدیث نبوی کا مقام

فصل سوم: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں حدیث کا مقام

فصل چہارم: خلفاء راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نظر میں حدیث کا مقام

فصل پنجم: ائمہ اربعہ کی نظر میں حدیث کا مقام

باب دوم:

فصل اوّل: حدیث کے بارے میں چند نظریات

فصل دوم: مضمون کے لحاظ سے حدیث کی اقسام

فصل سوم: فتنہ انکار حدیث

فصل چہارم: برصغیر کے چند منکرین حدیث کا تعارف

فصل پنجم: منکرین حدیث کے مراکز

فصل ششم: فتنہ انکار حدیث کے رد میں لکھی جانے والی کتب

باب سوم:

فصل اوّل: عبداللہ چکڑالوی کا تصورِ حدیث

فصل دوم: عبداللہ چکڑالوی کے تصورِ حدیث کا تنقیدی مطالعہ

باب اوّل

حدیث کا تعارف اور اس کا مقام

باب اوّل

حدیث کا تعارف اور اس کا مقام

فصل اوّل:

حدیث وسنت کا مفہوم اور دونوں میں فرق

فصل دوئم:

قرآن کی نظر میں حدیث نبوی کا مقام

فصل سوئم:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں حدیث نبوی کا مقام

فصل چہارم:

خلفاء راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نظر میں حدیث کا مقام

فصل پنجم:

ائمہ اربعہ کی نظر میں حدیث کا مقام

حدیث وسنت کا مفہوم اور دونوں میں فرق

حدیث کا مفہوم

الف۔حدیث کا لغوی مفہوم

لغوی اعتبار سے حدیث کے معنی ''گفتگو'' اور ''نئی چیز'' کے ہیں.....قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس سے مراد ''کلام'' ہے۔مثلاً:

﴿فَلْيَاْتُوا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ......﴾(الطّور (۵۲):۳۴)۔

﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ......﴾(المرسلٰت (۷۷):۵۰)۔

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ، اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا......﴾ (الكهف (۱۸):۶)۔

الحديث: الجديد من الاشياء۔ الحديث: الخبر يأتی علی القليل والكثير، والجمع: أحاديث (۱)۔

ب۔حدیث کا اصطلاحی مفہوم

علماء حدیث کی اصطلاح میں حدیث کا اطلاق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال، تقریرات اور صفات پر ہوتا ہے۔

حافظ ابن حجر اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"المراد بالحديث فی الشرع ما اضيف الی النبی صلی الله عليه وسلم كانه اريد به مقابلة القرآن لأنه قديم۔ (۲)

شرعی اصطلاح میں حدیث سے مراد وہ (قول وفعل) ہے جس کی نسبت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو گویا اس سے مراد وہ کلام ہے جو قرآن مجید کے مقابل ہے۔اس لئے کہ قرآن قدیم ہے۔(اور حدیث اس کے مقابلہ میں جدید ہے)۔

"ما أضيف الی النبی صلی الله عليه وسلم من قول أو فعل أو تقرير أو صفة" (۳)۔

۱- لسان العرب، باب الحاء ص۷۶۔

۲- تدريب الراوی فی اصول الحديث از جلال الدین سیوطی ص۴۔

۳- تيسر مصطلح الحديث از ڈاکٹر محمود طحان ص۱۴۔

من حدث عنی حدیثا وھو یری أنه کذب فھو أحد الکاذبین (۱)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری طرف سے کوئی حدیث بیان کرے اور وہ جانتا ہو کہ یہ جھوٹ ہے وہ کاذب ہے۔

سنت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

سنت سے طریقہ اور راستہ کا مفہوم مراد لینا عربوں کے یہاں کوئی نئی بات نہ تھی بلکہ عرب ظہور اسلام سے پہلے بھی سنت کے اس مفہوم اور اس کی ضد بدعت سے آگاہ و آشنا تھے۔ جب سنت کے لفظ کو اللہ کی طرف مضاف کر کے ''سنت اللہ'' کہا جاتا ہے تو وہ اس سے بھی سنت کا مفہوم سمجھ لیتے تھے۔ مثلاً قرآن میں فرمایا:

﴿سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ﴾ (احزاب (۳۳):۶۲)

(یہ اللہ کا طریقہ ہے ان لوگوں کے بارے میں جو گزر چکے)۔

جب عربوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے "علیکم بسنتی" (۲) کے الفاظ سنے تو انہوں نے فوراً سمجھ لیا کہ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے اطوار و آداب مراد ہیں۔

مدینہ منورہ ______ دیگر بلاد عالم کی نسبت سنت نبوی کا سب سے زیادہ حریص تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے "دار السنة" (۳) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

حدیث و سنت میں فرق

بالعموم حدیث و سنت مترادف استعمال ہوتے ہیں مگر ان کے درمیان ایک فرق بھی پایا جاتا ہے:

حدیث

شرعی اصطلاح میں حدیث سے مراد وہ اقوال و اعمال اور تقریر جن کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو۔ تقریر سے مراد محدثین کے ہاں کسی آدمی کا کوئی قول یا فعل جو آنحضرت ﷺ کے سامنے لایا گیا ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصحیح یا تغلیط نہ فرمائی ہو۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاموشی رضامندی ہے۔ یہ بھی حدیث میں داخل ہے۔

سنت

سنت سے مراد وہ دینی طریقہ ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات طیبہ میں گامزن رہے ہوں۔

۱- سنن ابن ماجه. باب من حدث عن رسول الله (حدیثا) وھو یری انه کذب۔

۲- ایضاً باب اتباع سنة الخلفاء الراشدین۔

۳- سنن ابن ماجه، فصل الرحلة فی طلب الحدیث۔

هذا الحديث مخالف للقياس والسنة والاجماع (۱)۔

(یہ حدیث قیاس وسنت اوراجماع کے خلاف ہے)۔

امام فی الحدیث و امام فی السنة وامام فیهما معا (۲)۔

(فلاں شخص حدیث میں امام ہے سنت میں امام ہے اور دونوں ہی میں امام ہے)۔

عبدالرحمٰن مہدی (م ۱۹۸ھ) فرماتے ہیں کہ سفیان ثوری حدیث میں امام ہیں، امام اوزاعی سنت میں اور امام مالک بن انس دونوں میں۔'' (۳)

اس اختلاف کے باوجود حفاظ حدیث ان الفاظ کو ہمیشہ مساوی ومترادف یا کم ازکم قریب المعنی سمجھتے رہے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کیونکہ مکمل طور پر سنت تو فقط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طور طریقہ کا نام ہے۔ جس کی تائید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکیمانہ اقوال واحادیث کرتی ہیں۔ پھر حدیث وسنت دونوں کا موضوع ایک ہے۔ دونوں کا مرکز ومحور یکساں طور پر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واعمال ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال کی تائید کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی تائید ہوتی تھی۔

۱- علوم الحديث ومصطلحه از ڈاکٹر صبحی صالح ص۲۰ (اردو ترجمہ غلام احمد حریری)

۲- ایضاً

۳- شرح مؤطا از امام زرقانی ج ۱ ص ۴

قرآن کی نظر میں حدیث نبوی کا مقام

مقامِ حدیث

تمام امت کا اجماع ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مسلمانوں کے لئے ہدایت کا اہم ذریعہ اور قانون کا دوسرا بڑا ماخذ ہے۔ قرآن پاک نے جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو متعارف کرایا اور مسلمانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس والہانہ محبت و شیفتگی کا اظہار کیا اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کو محفوظ اور قرآن پاک کی تشریحات و تعبیرات اور پیش آمدہ حالات کے احکام و قضایا کو مرتب کر دیا جائے تاکہ آئندہ نسلیں ان سے استفادہ کر سکیں۔

گویا حدیث و سنت کے سلسلہ میں مرکزی حیثیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو حاصل ہے، چنانچہ مقام حدیث کو متعین کرنے کے لئے مقام رسالت کے بارے میں تصور کا واضح ہونا ضروری ہے۔

اس سلسلہ کا بنیادی سوال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کیا ہے؟ اور نبی کی حیثیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام کیا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کام فقط اللہ کا پیغام پہنچا دینا اور اس پیغام پر عمل کر کے بتانا ہی نہ تھا بلکہ اس کی تفصیل و توضیح بھی کرنا تھا۔ مگر یہ سب کچھ صرف ان کے اپنے زمانے کے لئے نہ تھا بلکہ آئندہ زمانوں کے لئے بھی، بلکہ رہتی دنیا تک کے لئے تھا۔

قرآن کی نظر میں حدیث نبوی کا مقام

قرآنی نصوص و اشارات سے پتہ چلتا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم معلم بھی تھے، حاکم بھی تھے، قاضی بھی تھے اور سپہ سالار بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے افراد کی تربیت کر کے ان کو ایک منظم جماعت کی شکل دی اور ایک ریاست قائم کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس صالح معاشرے کی بنیاد رکھی وہ ایک مثالی معاشرہ تھا اور اسے آنے والے ہر دور کے لئے بطور مثال پیش ہونا تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کے تمام اہم تقاضوں کو پورا کیا، البتہ ایسی گنجائش موجود رہی کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کے تحت اجتہاد کی روح برقرار رہے۔

مندرجہ ذیل قرآنی نصوص حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض حیثیات کو نمایاں کرتی ہیں:

معلم و مربی

قرآن پاک میں چار ایسے مقامات ہیں جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور معلم و مربی پیش کیا گیا ہے:

۱۔ ﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾ (البقرہ (۲):۱۲۷-۱۲۹)۔

پروردگار! ان میں ایسا پیغمبر بھیج جو ان میں سے ہو، جو ان لوگوں کو آپ کی آیات پڑھ پڑھ کر سنائے اور ان کو (آسمانی) کتاب کی تعلیم دے اور حکمت کی باتیں سکھائے اور ان کو پاک کرے)۔

۲- ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرہ(۲):۱۵۱)۔

(جس طرح تم لوگوں میں ہم نے تم ہی میں سے ایک رسول کو بھیجا۔تم کو کتاب (الٰہی) اور فہم و دانائی کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور تم کو ایسی (مفید) باتیں تعلیم کرتے ہیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی)۔

۳- ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (آل عمران (۳):۱۶۴)۔

(حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں ان ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے ہیں)۔

۴- ﴿هُوَالَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔﴾ (الجمعہ(۶۲):۲)۔

(وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتے ہیں)۔

ان آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کی نوعیت بیان کی گئی ہے اور چار طریقے ان کے فرائض میں شامل کئے گئے ہیں:

۱-تلاوت آیات

۲-تعلیم کتاب

۳-تعلیم حکمت

۴-تزکیہ نفس

۱- تلاوت آیات

جہاں تک تلاوت آیات کا تعلق ہے وہ تو ظاہر ہے کہ جو کچھ بھی آپ پر نازل ہوا سے من وعن لوگوں کو سنادیں اور ان تک پہنچادیں۔اس میں آپ کی ذمہ داری فقط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کا ہر لفظ لوگوں تک پہنچ جائے۔قرآن پاک کی متعدد آیات میں اس کی طرف واضح اشارات موجود ہیں، مثلاً:

رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔﴾ (المائدہ(۵):۶۷)۔

(اے رسول جو جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ سب پہنچا دیجئے اور اگر ایسا نہ کریں گے تو آپ نے اللہ کا ایک پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا)۔

اس آیت میں تبلیغ کے ساتھ اگر چہ مفہوم و معانی کو پہنچانا بھی آجاتا ہے لیکن الفاظ کے پہنچانے کا ذکر صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ قرآن پاک کی دیگر آیات میں بھی واضح طور پر موجود ہے۔

تعلیم کتاب

تعلیم کتاب سے مراد معانی و مفاہیم کو ذہن نشین کرانا ہے اور اس کی بالعموم دو صورتیں ممکن ہیں:

قرآنی حکم کے مطابق عمل کر کے دکھانا۔

قرآنی آیات کی تشریح وتفسیر اپنی زبان میں بیان کرنا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی ہدایت کی تعلیم کے لئے یہی طریقے اختیار فرمائے، مثلاً: طریق نماز، تقسیم زکوٰۃ، آداب معاشرت اور تنظیم ریاست و معیشت کے بارے میں آپ کا عمل کتاب اللہ کی تعلیم کے مطابق ہے۔ اسے نظر انداز کر دینے سے تعلیم کتاب اللہ کی خود ساختہ کہانی تو بن سکتی ہے مگر وہ حقیقی تعلیم نہیں بن سکتی۔

نماز ہی کو لیجئے۔ اقامت صلاۃ ایک حکم ہے۔ قیام، رکوع، سجود، قعود اور تسبیح وتحمید سب چیزوں کا ذکر قرآن میں موجود ہے مگر اس کی عملی تشکیل اور طریق ادا فقط رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "صلوا کما رأیتمونی أصلی" (۱)۔

(نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتا دیکھتے ہو)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت جبریل نے نماز پڑھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اقتداء میں نماز ادا کی (۲)۔

اسی طرح حج کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ پاک ہے:

"خذوا عنی مناسککم لعلی لا احج بعد حجتی هذا" (۳)۔

(مجھ سے مناسک حج سیکھ لو شاید میں اس حج کے بعد حج نہ کر سکوں۔

متعدد قرآنی آیات کے پس منظر میں ایسے مخصوص واقعات و حالات ہیں جن کا تعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہے اور ان کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ کتاب اللہ ایک نہ حل

۱- مشکوۃ المصابیح، باب تاخیر الاذان۔

۲- صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ، باب مواقیت الصلاۃ وفضلها۔

۳- مشکوۃ، باب رمی الجمار۔

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾ (البقرہ(۲):۲۱۹)

(وہ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق دریافت کرتے ہیں)۔

﴿لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ. فِيْهِ رِجَالٌ) يُحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا﴾ (التوبہ(۹):۱۰۸)۔

(البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں (نماز کے لئے) کھڑے ہوں۔اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں)۔

﴿وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ.﴾ (التوبہ(۹):۱۱۸)۔

اوران تین شخصوں کے حال پر بھی (توجہ فرمائی) جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا۔یہاں تک کہ زمین باوجود اپنی فراخی کے ان پر تنگ ہونے لگی۔

ان آیات کے پس منظر میں جو واقعات ہیں اگر قرآن کا طالب علم انہیں سامنے نہ رکھے تو وہ کوئی نتیجہ نہیں نکال سکے گا۔

قولی تشریح

قولی تشریح سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات میں مختلف آیات قرآنی کی تشریح وتعبیر میں فرمائے۔

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ (النحل(۱۶):۴۴)۔

(اور ہم نے تیری طرف یہ ذکر (کتاب) اتارا تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے تو اس کو کھول کر بتادے۔ شاید وہ سوچیں)۔

﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾ (المائدہ(۵):۱۵)۔

(اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا کہ کتاب کی جو باتیں تم چھپاتے تھے وہ ان کو تمہارے لئے ظاہر کردے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرے)۔

﴿وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُم الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ.﴾ (النحل(۱۶):۶۴)۔

(اور ہم نے کتاب نہیں اتاری لیکن اس لئے تاکہ تو واضح کردے کہ اس کو جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور ایمان والوں کے لئے راہنمائی اور رحمت بنا کر اس کو اتارا)۔

ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے احکام وقوانین کو لے کر اس فہم وبصیرت سے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کی ہے لوگوں کے درمیان عدل وانصاف کریں۔

اللہ تعالیٰ کی دکھائی اور سمجھائی ہوئی فہم وبصیرت ہی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل، قضایا اور فیصلوں کی صورت میں محفوظ ہے (۱)۔ اور یہ وحی الٰہی کے بعد قانون اسلامی کا دوسرا ماخذ ہے۔ کتاب اللہ کی تبین قولی تشریح قرار دی جاسکتی ہے۔ اس قولی تشریح کی بھی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱- کسی آیت کا ذکر کر کے یا اس کی طرف اشارہ کر کے اس کی تفسیر یا اس سے مستنبط مسائل وافکار کو بیان کرنا۔

۲- وہبی علم اور مخصوص فہم کی بناء پر آیت کا حوالہ دیئے بغیر استخراج واستنباط کو بیان کیا۔

قرآن پاک کی ایسی بہت سی آیات اور متعدد مقامات ہیں جن کی توضیح کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی ضرورت پڑی، مثلاً:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرہ (۲):۱۴۳)۔

(اور ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنا دیا ہے جو اعتدال پر ہے تاکہ تم لوگوں کے مقابلہ میں گواہ رہو اور تمہارے لئے رسول اللہ گواہ ہوں)۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دریافت کرنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نوح علیہ السلام سے پوچھیں گے کہ تو نے میرا پیغام پہنچایا تھا، وہ اثبات میں جواب دیں گے، لیکن امت انکار کردے گی اس پر امت محمدیہ گواہ بنے گی (۲)۔

﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ﴾ (البقرہ (۲):۱۸۷)۔

(کھاتے پیتے رہو، یہاں تک کہ سیاہ وسفید دھاگے میں تمہیں فرق معلوم ہونے لگے)۔

جب روزہ کے احکام میں یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن حاتم نے سفید اور سیاہ دو دھاگے لے کر اپنے تکیہ میں رکھ لئے اور شب بھر ان کو دیکھتے رہے، جب دونوں کا رنگ نظر آنے لگا تو کھانا پینا بند کردیا۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عدی! تمہارا تکیہ بڑا لمبا چوڑا معلوم ہوتا ہے۔ جس میں رات اور دن دونوں سما جاتے ہیں۔ یہاں سفید اور سیاہ دھاگے نہیں بلکہ رات کا اندھیرا اور دن کی سفیدی مراد ہے۔

اس کے بعد مزید توضیح کے لئے آیت ''من الفجر'' کا ٹکڑا نازل ہوگیا تاکہ اس غلط فہمی کا اعادہ نہ ہو۔

۱- سیرة النبی، ج۴ص۱۸۴۔

۲- جامع صحیح البخاری، کتاب التفسیر۔

(جو لوگ ایمان لائے پھر انہوں نے اپنے اپنے ایمانوں میں کوئی ظلم شامل نہیں کیا یہی لوگ ہیں جن کو امن ملے گا اور یہی ہدایت یافتہ ہیں)۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا اٹھے اور دربارِ رسالت میں عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے ایسا شخص کون ہے جس نے ایمان لانے کے بعد کوئی ظلم نہ کیا ہو؟ اس آیت کے بموجب تو ہم میں سے کوئی بھی امن اور ہدایت کا مستحق نہیں رہتا۔فرمایا: یہاں ظلم سے مراد ہر معصیت نہیں بلکہ خاص شرک مراد ہے۔جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے کہ "ان الشرك لظلم عظيم" یہ جواب سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل مطمئن ہو گئے۔

کتاب اللہ کی جامعیت اور اس کی صحیح مراد سمجھنے کے لئے ایک ایسے معلم کی بھی ضرورت ہے جو کہ اپنی عقل سے نہیں بلکہ اللہ کی ہدایت کے مطابق حسب ضرورت اس کی تفصیل بیان کرتا رہے۔

کتاب اللہ کے ساتھ اگر کوئی معلم نہ ہو تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے معلم کے ساتھ کتاب نہ ہو۔اس لئے کتاب اللہ کا رشتہ رسول سے ہرگز قطع نہیں کیا جا سکتا۔جو رشتہ کہ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین ہے وہی کتاب اللہ اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان سمجھنا چاہئے (۱)۔

تعلیم حکمت

قرآن مجید نے تعلیم کتاب کے ساتھ ساتھ تعلیم حکمت کا بھی ذکر کیا ہے۔تعلیم حکمت نبی کے فرائض میں شامل ہے۔سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ تعلیم حکمت سے کیا مراد ہے؟ اور اسے قرآن حکیم نے کس طرح بیان کیا ہے؟ مندرجہ ذیل آیات میں حکمت کا ذکر خصوصیت سے آیا ہے:

﴿حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ﴾ (القمر(۵۴)۵)

(یعنی اعلیٰ درجہ کی دانشمندی (حاصل ہوسکتی) ہے۔سو خوف دینے والی چیزیں ان کو کچھ فائدہ ہی نہیں دیتیں)۔

﴿وَاِذْ اَخَذَاللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ (آل عمران(۳):۸۱)۔

(اور جب کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور علم دوں تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو تصدیق کرنے والا ہو۔اس کا جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس رسول پر اعتقاد بھی لانا اور اس کی طرف داری بھی کرنا)۔

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾۔ (النحل(۱۶):۱۲۵)۔

۱- ترجمان السنۃ ج ا ص ۱۰۵

بحث کیجئے)۔

﴿وَاذْكُرْنَ مَايُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا﴾۔ (احزاب (۳۳):۳۴)۔

(اورتم ان آیات الٰہیہ کواوراس علم (احکام) کو یادرکھو جس کا تمہارے گھروں میں چرچا رہتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ راز دان ہے پورا خبردار ہے)۔

﴿فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا﴾ (النساء(۴):۵۴)۔

(سو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کو کتاب بھی دی ہے اور علم بھی دیا ہے اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سلطنت بھی دی ہے)۔

﴿وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ (النساء(۴):۱۱۳)

(اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور علم کی باتیں نازل فرمائیں اور آپ کو وہ باتیں بتلائی ہیں جو آپ نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے)۔

﴿اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ﴾ (المائدہ(۵):۱۱۰)۔

(اور جب کہ میں نے تم کو کتاب، سمجھ کی باتیں تورات اور انجیل کی تعلیم دی)۔

ان تمام آیات میں حکمت کو کتاب سے علیحدہ اور مستقل حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔علماء امت متفق ہیں کہ حکمت سے مراد نبی کا خاص فہم ہوتا ہے جس کی رہنمائی اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔اس خاص فہم کو پیغمبرانہ بصیرت کے ساتھ ساتھ وحی خفی کے نام سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔جس طرح نبی کے علم سے مراد وہ علم ہوتا ہے جو انہیں اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی عطا کرتا ہے، اسی طرح حکم یا حکمت سے مراد معمولی فہم نہیں بلکہ وہ خاص فہم ہے جو وحی خفی سے ملتا ہے۔

حکمت کا مفہوم

حکمت کا مادہ حکم ہے اور حکم کے معنی ہیں منع للاصلاح ہے۔(۱) کسی کی اصلاح کے لئے کسی کو کسی امر سے باز رکھنا۔اسی لئے لگام کو بھی حکمت کہتے ہیں کیونکہ اس سے گھوڑے کو سرکشی سے باز رکھا جاتا ہے۔مشہور مصرع ہے:

"ابنی حنیفة احکموا سفهائکم"

(اے بنی حنیفہ اپنے احمقوں کو شرارت سے روکو)۔

۱- مفردات از امام راغب ص ۶۵۔

۲- سیرۃ النبی ج ۴ بحوالہ البحر المحیط ج ۱ ص ۳۹۳۔

وضع الأشیاء مواضعها (۲)۔

(یعنی اشیاء کو اپنے صحیح محل پر رکھنا) اور ان کو غیر صحیح محل پر استعمال ہونے سے روکنا۔ صاحب لسان العرب نے حکمت کے مفہوم کو اس طرح بیان کیا ہے:

"الحکمة عبارة عن معرفة افضل الاشیاء بافضل العلوم (۱)۔

ابن جریر طبری اپنا فیصلہ سناتے ہیں:

"قال ابن جریر الطبری: والصواب من القول عندنا فی الحکمة أنها العلم .... بمعنی الفصل بین الحق والباطل (۲)۔

ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت ان احکام الٰہی کے علم کا نام ہے جو صرف رسول کریم کے بیان وتشریح سے معلوم ہوتے ہیں اور ان کی جو مثالیں اور نظیریں ہیں ان کی معرفت کو کہتے ہیں اور حکمت کا لفظ میرے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے جس کے معنی حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔

امام شافعیؒ نے اپنی کتاب الرسالة میں قتادہ کے مسلک کو پسند کیا ہے، لکھتے ہیں:

"وسمعت من ارضی من اهل العلم بالقرآن یقول: الحکمة سنة۔ (۳)

میں نے قرآن کے ان اہل علم سے جنہیں میں پسند کرتا ہوں یہ سنا ہے کہ حکمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا نام ہے۔ سید سلیمان ندوی نے حکمت کے مفہوم پر بہت اچھی گفتگو کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''آئمہ لغت اور علماء قرآن کے تمام اقوال پر ایک غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ یہ کل کے کل ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی حقیقت کی متعدد تفسیریں ہیں۔ حکمت عقل وفہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے جس سے صحیح و غلط، صواب وخطا، حق و باطل اور خیر وشر کے درمیان تمیز و فیصلہ بذریعہ غور وفکر، دلیل و برہان اور تجربہ و استقراء کے نہیں، بلکہ منکشفانہ طور سے ہو جاتا ہے...... (۴)۔

اسی موضوع پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد سید صاحب فرماتے ہیں:

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اصل حکمت نبوی وہ نور نبوت اور الہامی معرفت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب و دماغ میں ودیعت کیا تھا چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن واقوال آپ

۱- لسان العرب ج ۱۲ باب المیم ص ۱۴۰۔
۲- سیرۃ النبی ج ۴ ص ۱۵۵ بحوالہ تفسیر الطبری ج ۳۔
۳- سیرۃ النبی ج ۴ ص ۱۵۶ بحوالہ الرسالة ص ۶۴۔
۴- سیرۃ النبی ج ۴ ص ۱۵۶۔
۵- سیرۃ النبی ج ۴ ص ۱۶۵۔

ان پر بھی حکمت کا اطلاق جائز ہے(۵)۔

حکمت کے اس لغوی مفہوم کے بعد اگر ہم ان آیات پر غور کریں جن میں کتاب کے ساتھ حکمت کو بیان کیا گیا ہے تو اس سے حقیقت دین مراد لی جاسکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے حکمت کتاب بھی کہا جاسکتا ہے، یعنی کتاب (قرآن) میں جو اوامر و نواہی جو احکامات و ارشادات، جو دروس و عبرت اور پند و نصائح مذکور ہیں ان کی ماہیت کا صحیح صحیح علم اور ان پر صحیح صحیح عمل ہو۔ یہ صحیح علم و عمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر رسول کو کتاب کے ساتھ عطا فرمایا جاتا ہے۔ اسی طرح رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنی کتاب کا علم و عمل اللہ تعالیٰ ہی نے مرحمت فرمایا اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی علم و عمل ہے جس کی تعبیر سنت سے کی جاتی ہے۔ قرآن پر عمل کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال پر عمل کرنا پڑے گا۔ ان آیات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حکمت، یعنی سنت منزل من اللہ ہو، کیونکہ اگر کتاب اللہ کے احکام کے مصداق و مدلول کا تعین عقل انسانی کے سپرد کر دیا جائے تو احکام الٰہی اہل خرد کی موشگافیوں کی بھینٹ چڑھ جائیں گے اور امت کی وحدت و یک جہتی جو اس کی زندگی کی کفیل اور بقاء کی ضامن ہے کسی ٹھوس اور مضبوط نظام حیات کی غیر موجودگی سے افتراق کی نذر ہو جائے گی (۱)۔

تعلیم کتاب و حکمت ہی کی بنیاد پر نبی کی حیثیت شارح کتاب اللہ تعالیٰ کی ہوگی۔ چنانچہ قرآن پاک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب اللہ کے شارح کی حیثیت سے پیش کیا ہے کہ وہ کتاب اللہ کے اجمال کی تفصیل و تفسیر اس کے اطلاق کی تقید بیان فرمائیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ توضیح و تشریح صرف کتاب اللہ کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے نہیں ہوتی۔ اس کے قول و عمل کی تفسیر ضروری ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری ہے کہ اپنے عملی مظاہرہ سے صاحب کتاب کا منشاء و مقصود عیاں کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کتاب اللہ کی مقتضیات کی عملی تشریح و تعبیر تھی۔

قرآن پاک نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حیثیت کو اس طرح بیان کیا:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ﴾ (النحل (۱۶):۴۴)۔

(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ ذکر ہم نے تمہاری طرف اس لئے نازل کیا کہ تم لوگوں کے لئے واضح کر دو اس تعلیم کو جو ان کی طرف اتاری گئی)۔

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و اعمال کے بغیر کتاب اللہ اور منشاء الٰہی کو سمجھنا ممکن نہیں۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت نمونہ تقلید

قرآن پاک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک رہبر و رہنما کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ ان کی پیروی کا حکم دیتا ہے اور

۱۔ سنت خیر الانام ص ۶۵، ۶۶۔

جو شخص انہیں نمونہ تقلید نہیں سمجھتا وہ خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔اس کے ساتھ یہ بھی بیان کیا کہ ان کی قیادت سے انکار کفر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا تا کہ اپ کی ذات کو انسانی عظمت وشرافت اور حیات اسلامی کی مکمل ہیئت کا معیار بنایا جا سکے۔قرآن پاک کی ان آیات پر غور فرما کر فیصلہ کیجئے کہ کس طریق پر آپ کی ذات کو انسانیت کے لئے نمونہ قرار دیا گیا۔ارشاد ربانی ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوااللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ﴾ (احزاب (۳۳):۲۱)۔

(تمہارے لئے اللہ کے رسول میں ایک نمونہ تقلید ہے۔ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو)۔

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران (۳):۳۱)۔

(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمائیں کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا)۔

﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ﴾ (آل عمران (۳):۳۲)۔

(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمادیں کہ اطاعت کرو اللہ اور رسول کی۔پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا)۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت شارع

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالی نے آپ کو شارع قرار دیا ہے۔قرآن کریم میں نہایت صریح الفاظ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریعی اختیارات (Legislative Powers) عطا کئے گئے ہیں۔اللہ کی طرف سے امرونہی اور تحلیل وتحریم صرف یہی نہیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں بلکہ وہ سب ہیں جنہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام یا حلال قرار دیا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی حکم دیا یا جس سے بھی منع فرمایا وہ سب اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات سے ہی ہے۔اس لئے وہ قانون خداوندی کا ایک حصہ ہے۔اس امر کے ثبوت میں اللہ تعالی فرماتا ہے:

﴿يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ﴾ (الاعراف (۷):۱۵۷)۔

(وہ ان کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے ان کو روکتا ہے اور ان کے لئے پاک چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور بندھن اتار دیتا ہے جو ان پر چڑھے ہوئے تھے)۔

﴿وَمَاۤ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوااللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ (الحشر (۵۹):۷)۔

(جو کچھ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دے وہ لےلو اور جس چیز سے تم کو روک دے تم رک جاؤ اور اللہ تعالی سے ڈرو بے شک اللہ تعالی سخت سزا دینے والا ہے)۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت قاضی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے منصف اور قاضی بنایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حیثیت رسالت ہی کا ایک حصہ ہے۔ کوئی مسلمان بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صادر کردہ فیصلوں سے سرتابی نہیں کرسکتا کہ ایسا کرنا کفر ہے، بلکہ دل میں تنگی محسوس کرنا بھی اللہ کے ہاں ناپسندیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فیصلہ صادر کرنے میں مستقل حیثیت عطا کی ہے۔ نزاع کی صورت میں جو مراجع انصاف بیان کیے گئے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاتم الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی موجود ہے۔ ان دونوں مراجع سے منہ موڑنا منافقت ہے اور جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور جج تسلیم نہیں کرتا یا آپ کے فیصلے سے ملال محسوس کرتا ہے اس کا ایمان ختم ہو جاتا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا:

﴿إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرَاكَ اللَّهُ﴾ (النساء(۴):۱۰۵)۔

(بے شک ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ نوشتہ بھیجا ہے واقعہ کے مطابق تاکہ آپ ان لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو بتلا دیا ہے)۔

﴿وَقُلْ آمَنتُ بِمَآ أَنزَلَ اللَّهُ مِن كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ﴾ (الشوریٰ(۴۲):۱۵)۔

(اور آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے جتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں سب پر ایمان لاتا ہوں اور مجھ کو یہ (بھی) حکم ہوا ہے کہ (اپنے اور) تمہارے درمیان عدل رکھوں)۔

﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوٓا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ (النور(۲۴):۵۱)۔

(مسلمانوں کا قول تو جبکہ (کسی مقدمہ میں) اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ ان کے درمیان میں فیصلہ کر دیں یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا)۔

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَآ أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا﴾ (النساء(۴):۶۱)۔

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تو آپ منافقین کی یہ حالت دیکھیں گے کہ آپ سے پہلوتہی کرتے ہیں)۔

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (النساء(۴):۶۵)۔

(پس قسم ہے آپ کے رب کی کہ یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرا ویں۔ پھر آپ کے اس تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور پورا پورا تسلیم

رسول صلی اللہ علیہ وسلم بحثیت فرمانروا

قرآن مجید کی متعدد آیات یہ بتاتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ حاکم ہیں ۔ یہ منصب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحثیت رسول عطا ہوا ہے ۔ ایسا نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود ریاست قائم کر کے حاکم بن بیٹھے ہوں یا لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منتخب کر کے فرمانروا بنا دیا ہو۔ رسالت سے علیحدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانروائی کوئی شے نہیں ۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول ہونا ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حاکم ومطاع ہونے کی دلیل ہے ۔ بطور حاکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے ۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت اطاعت سے منحرف ہونے والا دراصل اللہ کی حاکمیت کا انکاری ہے ۔اس سلسلے میں یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ اوّلین اطاعت اللہ تعالیٰ کی ہے ۔اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، پھر ان اطاعتوں کے تحت غیر نبی اولی الامر کی ۔

اولوالامر کی اطاعت ان دو اطاعتوں سے مشروط ہے ۔اگر اولی الامر کسی ایسے امر کا حکم دے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے انحراف پر مبنی ہو تو پھر کوئی اطاعت نہیں ۔قرآن پاک ان آیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمانروائی کا تذکرہ موجود ہے ۔ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (النساء(۴):۶۴)۔

(اور ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اسی واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ بہ حکم خداوندی ان کی اطاعت کی جائے)۔

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ﴾ (محمد(۴۷):۳۳)۔

(اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور (کفار کی طرح اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر کے) اپنے اعمال کو برباد مت کرو)۔

﴿وَمَاكَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا﴾ (الاحزاب(۳۳):۳۶)۔

((پھر) ان (مومنین) کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا)۔

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (النساء(۴):۵۹)۔

(اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور تم میں جو لوگ اہل حکومت ہیں ان کا کہنا مانو۔ پھر اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ اور رسول کے حوالہ کر لیا کرو اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو)۔

کردہ یہی حیثیات ہیں جن کے پیش نظر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک ایک گوشہ محفوظ کرنا شروع کردیا۔

قرآن پاک نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو ماخذ قانون کی حیثیت سے پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام مناصب رسالت کے اجزائے لاینفک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ اس امر پر متفق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قرآن کے بعد دوسرا قانونی ماخذ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو بے پناہ محبت تھی اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کرلیا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال وارشادات کو سنت کہتے۔ سنت کی اصطلاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ہی میں عام ہوگئی تھی اور مسلمان اس کے مفہوم سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سنت کی ضد بدعت ہے۔

ل سوم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں حدیث نبوی کا مقام

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو سنت کے خلاف جانے سے روکا ہے اور قرآن حکیم اور اپنی سنت طیبہ دونوں کی پابندی کا حکم دیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت کی اہمیت کا احساس ان الفاظ میں دلایا:

"ترکت فیکم امرین لن تضلوا ماتمسکتم بهما. کتاب الله وسنتی" (۱)۔

(میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جب تک تم انہیں تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری سنت)۔

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ما أمرتکم به فخذوه، ومانهیتکم عنه فانتهوا" (۲)۔

(جس عمل کے کرنے کا میں تمہیں حکم دوں اسے کرو اور جس عمل سے میں تمہیں منع کروں اس سے باز رہو)۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"من اطاعنی فقد اطاع الله و من عصانی فقد عصی الله" (۳)۔

(جس نے میری اطاعت کی گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی)۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت دائمی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ لہٰذا آپ کی سنت کی پیروی بھی تا قیامت واجب ہے۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ایسا وقت آنے والا ہے جب کوئی شخص چارپائی پر تکیہ لگائے بیٹھا ہوگا۔ اس کے سامنے میری حدیث بیان کی جائے گی وہ کہے گا ہمارے پاس کلام الٰہی ہے۔ اس میں جن چیزوں کو جائز قرار دیا گیا ہے ہم انہیں جائز سمجھتے ہیں جو چیز اس میں حرام قرار دی گئی ہے ہم انہیں حرام سمجھتے ہیں۔ خبردار! جن چیزوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا ہے ان کی حرمت بھی بالکل ویسے ہی ہے جیسے اللہ جل شانہ نے حرام قرار دیا ہو۔''

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۱- جامع بیان العلم. ج ۲ ص ۱۸۰

۲- سنن ابن ماجه. کتاب السنة باب اتباع سنة رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم۔

۳- ایضاً

وایاکم ومحدثات الامور کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة"۔

(کامیابی اور کامرانی کے لئے (تمہارے پاس) دو چیزیں ہی ہیں، کتاب اور مثالی کردار۔ سب سے بہترین کتاب الٰہی (قرآن) ہے۔ سب سے بہترین نمونہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار ہے۔ خبردار! دین میں نت نئے اعمال بڑھانے سے بچو۔ دین میں ہر نئے عمل کا اضافہ بدعت ہے۔ ہر بدعت کا انجام تباہی ہے)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ہی ارشادات کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں حفاظت حدیث وسنت کی تحریص وتشویق پیدا ہوئی۔ جس مسلمان کا دل ودماغ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے وابستہ ہو لیکن خود کو اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں نہ ڈھالے وہ نہ تو صادق الایمان ہو سکتا ہے اور نہ مقرب بارگاہ ایزدی بن سکتا ہے۔

سنت کی محبت اور بدعت کے خوف نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ہی میں حفاظت حدیث کے مواقع پیدا کر دیئے تھے اور لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو حافظے میں محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ لکھ بھی لیتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے جملہ گوشوں کو محفوظ کر لیا تھا۔

حجۃ الوداع آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ تھا۔ اس میں ایک لاکھ کے لگ بھگ صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مہتمم بالشان خطبات ارشاد فرمائے۔ ان کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشاعت حدیث کے بارے میں بھی احکام صادر فرمائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لیبلغ الشاھد الغائب فان الشاھد عسی ان یبلغ من ھو أوعی له منه" (۱)۔

(جو (مجمع میں) حاضر ہیں وہ (میری باتیں) ان کو پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ حاضر کی بہ نسبت غائب زیادہ قوتِ حافظہ رکھتا ہو)۔

غائب سے مراد دو قسم کے افراد ہو سکتے ہیں:

۱- جو زندہ موجود تھے لیکن حجۃ الوداع میں شریک نہ ہو سکے۔

۲- بعد میں آنے والی نسلیں۔ اسی فرمان کی بناء پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو کچھ سنا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا وہ تابعین رحمہم اللہ تک منتقل کر دیا اور تابعین سے یہ مبارک ذخیرہ اپنے تلامذہ تبع تابعین تک پہنچا۔ اس طرح یہ احادیثِ نبویہ سینہ بہ سینہ اور سفینہ در سفینہ (کتاب در کتاب) ہم تک پہنچ گئیں۔

حدیث کی اہمیت کے پیش نظر موضوع (من گھڑت) روایات کو بیان کرنے اور ان کو لوگوں میں پھیلانے سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا ہے۔

سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مجھ سے حدیث سے روایت کرتا ہے یہ جانتے ہوئے کہ وہ جھوٹ ہے تو ایسا شخص جھوٹوں میں سے ایک ہے (۲)۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ سے حدیث بیان کرنے سے پرہیز کرو مگر ایسی احادیث جن کا تم علم رکھتے ہو۔ اس لئے جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھتا ہے وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے۔ (۳)

۱- صحیح بخاری۔ کتاب العلم باب قول النبی ربّ مبلغ اوعی (من) سامع۔

۲- صحیح مسلم مع شرح النووی ج۱۔

۳- جامع ترمذی ابواب تفسیر القرآن۔

فصل چہارم

خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نظر میں حدیث کا مقام

۱۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حدیث نبوی

"وكانت الأئمةُ بعد النبى صلى الله عليه وسلم يَسْتَشِيْرُوْنَ الأمنا من اهل العلم فى الأمور المباحةِ لِيَأخذوا بأسهلها فاذا وضح الكتاب أوِالسنَّةُ لم يَتَعَدَّوْهُ اِلَى غيرهِ اقْتِداءَ بِالنَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم وَرأى أبوبكرٍ قِتَالَ مَنْ مَنَعَ الزَّكوةَ، فقال عُمَرُ: كَيْفَ تُقَاتِلُ؟ وقد قَالَ رسول اللّٰه أُمِرت أن أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوا: لااِله اِلَّا اللّٰهَ، فَاِذا قَالُوا: لا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، عَصَمُوا مِنِّى دِمَاءَ هُمْ وأموالهم اِلا بحقِّهاوُ، فَقَالَ أبوبكرٍ واللّٰهِ لأُقَاتِلَنَّ من فَرَّقَ بين ماجمع رسول اللّٰه ثُمَّ تابعه بَعْدُ عمر، فلم يلتفت أبوبَكرٍ اِلى مشورةٍ اِذ كان عنده حكم رسول اللّٰه فى الذين فرقوا بين الصَّلٰوةِ والزَّكوةِ، وأُرادوا تبديل الدِّين وأحكامِهِ و قال النبى اللّٰه عليه وسلم مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلوه"(۱)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے اسلام مباح امور میں قابل اعتماد اہل علم سے مشورہ لیا کرتے تھے تاکہ سہل ترین راہ اختیار کرسکیں۔ جب کتاب وسنت کا واضح حکم سامنے آجاتا تو پھر کسی دوسری چیز کی طرف رُخ نہ کرتے کیونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی طرزِ عمل تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ سے جہاد کا ارادہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا آپ ان پر کیسے فوج کشی کر سکتے ہیں حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں۔ یہاں تک کہ وہ کلمہ پڑھ لیں۔ اس طرح وہ مجھ سے اپنی جانیں اور مال محفوظ کرلیں گے۔ الا یہ کہ اسلام کا حق ان سے وابستہ ہو۔ اور ان کا محاسبہ اللہ کے ذمہ ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ بخدا میں ان لوگوں سے جہاد کروں گا جو ان چیزوں کے درمیان تفریق پیدا کرتے ہیں جن کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سی حیثیت دی ہے۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ان ہی کے ہمنوا ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے مشورہ کی پرواہ نہ کی کیونکہ ان کے پاس نماز اور زکوٰۃ کے مابین تفریق کے قائلین کے بارے میں حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھا۔ اس قسم کے لوگ دین کے احکام بدل دینا چاہتے ہیں ان کے بارے میں رسول اللہ کا ارشاد ہے جو دین تبدیل کرے اسے قتل کر ڈالو۔

اس بارے میں غور طلب معاملہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مانعین زکوٰۃ سے جہاد کرنے سے حدیث کی بنیاد پر روکا تھا۔ اب اگر حضرت ابوبکر حدیث کو صرف تاریخ دین سمجھتے تھے تو ان کو

---

۱ صحیح بخاری۔ کتاب الاعتصام باب قول الله تعالى امرهم شورى بينهم۔

بیان کیا جس سے ان کی غلط فہمی رفع ہوگئی اور ان کی پیش کردہ روایت کا مفہوم بھی واضح ہوگیا۔

حافظ ابن قیم نے سنت اور حدیث کے بارے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل اس طرح نقل کیا ہے کہ:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے جب کوئی مسئلہ آتا پہلے وہ کتاب اللہ میں اس کا حل تلاش کرتے اگر وہاں نہ پاتے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف رجوع فرماتے، اگر اس موقع پر بھی ناکام رہتے تو پھر لوگوں سے دریافت کرتے کہ کیا اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کا کسی کو علم ہے؟ بارہا ایسا ہوا ہے کہ اس طرح سوال کرنے پر لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کی اطلاع آپ کو دی ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:

"کان ابوبکر اذا ورد علیه حکم نظرفے کتاب الله تعالی فان وجد فیه مایقضی به قضی به وان لم یجد فے کتاب الله نظر فی سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم فان وجد فیها مایقضی به قضی به فان اعیاه ذلك سأل الناس هل علمتم ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قضی فیه بقضاءٍ فربما قام الیه القوم فیقولون قضی فیه بکذا وکذا" (۱)۔

تاریخ الخلفاء میں مزید الفاظ ملتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ اس قسم کے مواقع پر لوگوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سن کر خوشی سے یہ فرماتے: الحمدلله الذی جعل فینا من یحفظ عن نبیننا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہم میں سے ایسے لوگوں کو باقی رکھا ہے جن کے سینوں میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت محفوظ ہے (۲)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ترکہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے اپنے اپنے حصہ کا مطالبہ کیا اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنھن نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ذریعے اپنا حق وراثت طلب کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سب کو ایک ہی حدیث سنا کر مطمئن کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''لانورث ماترکنا صدقة'' یعنی انبیاء کرام کا ترکہ میراث کے طور پر تقسیم نہیں ہوتا (۳)۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جنہیں مطالبہ پر اصرار تھا، بعد میں وہ بھی راضی ہوگئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں یہ نزاع پیدا ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں دفن کیا جائے، اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا رجحان مختلف مقامات کی طرف تھا۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سنا کر اس نزاع کا خاتمہ کر دیا:

۱- اعلام الموقعین ج۱ ص۶۲ طبع مصر۔

۲- تاریخ الخلفاء ص۹۳ طبع بیروت۔

۳- مشکوۃ: باب وفات بنی صلی الله علیه وسلم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد تاریخ اسلام کا وہ نازک مرحلہ پیش آیا کہ جس کی بناء پر قریب تھا کہ انصار و مہاجرین کے درمیان خلافت کے بارے میں اختلاف کی نوعیت شدید صورت اختیار کر جاتی۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم "الائمة من قريش" یعنی امراء و خلفاء قریش میں سے ہوں گے۔ پیش کر کے انصار کے جوش کو ٹھنڈا کر دیا اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جب دادی کے حق کے بارے میں سوال کیا گیا کہ وہ اپنے پوتے کی میراث میں سے کتنا حصہ پائے گی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا تو محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بتلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ دلوایا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسی کے مطابق فیصلہ کیا (۲)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں بعینہٖ وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو مذکورہ بالا واقعات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ مختصر طور پر چند نظائر یہاں پیش کئے جاتے ہیں:

۱- قال عمر سياتى قوم يجادلونكم بشبهات القران فخذو هم بالسنن فان اصحاب السنن اعلم بكتاب الله (۳)۔

۱- (آئندہ ایسے لوگ وجود میں آئیں گے جو قرآنی آیات کے بارے میں شبہات پیدا کر کے تم سے بحث و مجادلہ کریں گے۔ ایسے لوگوں پر تم سنن (احادیث) کے ذریعے گرفت کرو۔ اس لئے کہ سنن والے اللہ کی کتاب کا زیادہ علم رکھتے ہیں)۔

یعنی قرآنی مجید کا صحیح فہم، سنت و حدیث کے علم پر موقوف ہے، ورنہ انسان شبہات و شکوک کی وادی میں بھٹکتا پھرے گا۔

۲- ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں اپنے عمال (گورنر) تمہارے پاس اس لئے نہیں بھیجتا ہوں کہ وہ تمہیں مار مار کر چمڑی ادھیڑ دیں اور تمہارے مال مویشی تم سے زبردستی چھین لیں بلکہ میں تو ان کو اس لئے بھیجتا ہوں کہ تمہیں، تمہارا دین اور تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سکھلائیں (۴)۔

۳- حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ شام کے ارادے سے نکلے۔ جب آپ مقام سرغ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ شام

۱- جامع ترمذی۔ کتاب الجنائز باب این تدفن الانبیاء۔

۲- مؤطا امام مالک۔ کتاب الفرائض باب میراث الجدة۔

۳- مقدمہ المیزان للشعرانی ص۲۲۔

۴- اعلام الموقعین۔ اردو ترجمہ حصہ سوئم ص۲۵۳۔

بحث و گفتگو کے باوجود کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔اس موقع پر حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث پیش کی کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جہاں وبا پھوٹ پڑی ہو اس جگہ جانا نہیں چاہئے۔

اس حدیث کو سن کر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اختلاف دور ہو گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ لشکر کے ساتھ مدینہ واپس تشریف لے آئے (۱)۔

ثم قال ایاکم ان تهلکو عن ایة الرجم. ان یقول قائل: لانجد حدین فی کتاب الله.

فقد رجم رسول الله صلی الله علیه وسلم ورجمنا (۲)

پھر آپ نے فرمایا:

(سنو! رجم کا حکم جھٹلا کر خدا کے عذاب کا نشانہ نہ بنو۔کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ یہ ہے کہ ہم اللہ کی کتاب میں دوحدوں کا ذکر نہیں پاتے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا (یعنی زانی کو سنگسار کیا) اور ہم بھی رجم کرتے ہیں)۔

۴- ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے من مانی تاویل اور بے بنیاد قیاس ورائے کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

"ایاکم واصحاب الرأی فانهم اعداء السنن، اعتیهم الأحادیث ان یحفظوها فقالوا بالرأی فضلوا واضلوا"۔

(لوگو! رائے اور من گھڑت قیاس آرائی کرنے والوں سے بچو۔اس لئے یہ لوگ سنت کے دشمن ہیں۔احادیث کے حفظ کرنے سے یہ لوگ عاجز رہ گئے ہیں۔اس بناء پر انہوں نے قیاس آرائی کا سہارا لیا نتیجہ یہ نکلا کہ خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کر ڈالا) (۳)۔

۵- حضرت عمر رضی اللہ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ مقتول شوہر کی دیت سے اس کی بیوی حصہ پائے گی یا نہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔اس موقع پر ضحاک بن سفیان حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہتے ہیں کہ میرے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نوشتہ موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشیم ضیابی کی بیوی کو اپنے شوہر کی دیت میں سے حصہ لینے کا حقدار ٹھہرایا تھا۔یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے فیصلے سے رجوع فرمایا (۴)۔

۶- ایران کے فتح ہونے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ سوال آیا کہ اہل فارس سے جزیہ لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ قرآن میں اس بارے میں کوئی واضح حکم موجود نہیں ہے۔

آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا۔اس موقع پر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف نے فرمایا

۱- صحیح مسلم باب الطاعون والطیعر۔

۲- مؤطا امام مالك. کتاب الحدود۔

۳- الاعتصام شاطبی ج۱ص۱۲۴۔

۴- سنن ابوداؤد. کتاب الخراج باب فی المرأة ترث من دیة۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ہجر'' کے مجوسیوں سے جزیہ لیا ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وضاحت کے بعد اہل فارس سے بھی جزیہ لینا شروع کر دیا (۱)۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مذکورہ بالا نظائر و شواہد کے علاوہ صحیح سند کے ساتھ بہت سے اقوال و واقعات منقول ہیں جس سے صاف طور پر سنت کے بارے میں ان کا موقف واضح ہو جاتا ہے۔

ان دونوں حضرات کے موقف کو قدرے تفصیل کے ساتھ اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ عام طور پر منکرین حدیث بعض آثار کو غلط رنگ دے کر ان دونوں بزرگوں پر انکار حدیث کی تہمت تراشتے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حدیث نبوی

۱- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ جس عورت کا شوہر مر جائے تو وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے۔ لیکن ابو سعید خدری کی بہن فریعہ بنت مالک نے اپنا واقعہ پیش کیا کہ میرا شوہر قتل کیا گیا تھا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوہر کے مکان پر عدت گزارنے کا حکم دیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی روایت کے مطابق فیصلہ کیا (۲)۔

۲- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حج کے موسم میں تمتع کے قائل نہ تھے لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی تو انہوں نے اپنے قول سے رجوع کر لیا (۳)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حدیث نبوی

۱- حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس چند مرتد افراد لائے گئے، آپ رضی اللہ عنہ نے ان کو آگ میں جلانے کا حکم دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حدیث پیش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"من بدل دینه فاقتلوه" یعنی مرتدین کا خاتمہ تلوار سے کیا جا سکتا ہے نہ کہ آگ میں جلا کر۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا: "صدق ابن عباس" یعنی ابن عباس سچ کہتے ہیں (۴)۔

۲- حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ فرمایا اگر دین کا مدار رائے اور قیاس آرائی پر ہوتا تو موزوں کے نیچے مسح کیا جاتا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں کے اوپر مسح کیا ہے (۵)۔

۳- حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کتاب و سنت کے اتباع کے معاملہ میں ٹھیک وہی روش اختیار کی جس پر حضرت ابو بکر

۱- سنن ابی داؤد۔ کتاب الخراج -

۲- مؤطا امام مالک۔ باب مقام المتوفی عنها زوجها -

۳- سنن نسائی۔ کتاب مناسک حج، باب التمتع -

۴- جامع الترمذی۔ کتاب الحدود باب ماجاء فی المرتد -

۵- عظمت حدیث ص ۲۸۹ بحوالہ عون المعبود ج ۱ ص ۶۳ طبع ہند -

''خداوند! جس طرح تو نے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی رہنمائی فرمائی ہے مجھے بھی اپنی ہدایت سے مالا مال کر دے۔

کسی نے سوال کیا: ''خلفائے راشدین سے کون سے لوگ مراد ہیں''؟ اس موقع پر آپ رضی اللہ عنہ کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور آپ نے فرمایا:

هما حبيباى ابوبكر وعمر اماما الهدى وشيخا الاسلام

یعنی خلفائے راشدین سے میری مراد ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہ ہیں جو میرے محبوب ہیں۔ ہدایت کے امام ہیں اور اسلام کی باعظمت شخصیتیں ہیں (۱)۔

خلفائے راشدین کے علاوہ دوسرے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال و آثار بھی پیش کیے جاتے ہیں۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی حیثیت کا نتیجہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے اردگرد اسی طرح منڈلاتے رہتے تھے جس طرح شمع کے گرد پروانے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو کام کرتے اس کو بچشم خود ملاحظہ کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں اپنے کانوں سے سنتے اور ان کو دل میں جگہ دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مضبوطی سے تھام لیتے اور اس کے اور قرآنی احکام و اوامر کے مابین کوئی فرق و امتیاز روا نہ رکھتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے حدیث نبوی کو حد درجہ عظمت و وقعت کی نگاہ سے دیکھا اور ہر اس شخص کی مذمت کی جس نے حدیث کے بارے میں کسی قسم کا غلط تصور قائم کیا۔ ابونضرہ جناب عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ان کے یہاں حاضر ہو کر ایک بات پوچھی جو انہوں نے بتا دی۔ سائل نے کہا کتاب اللہ کی بات کیجئے۔ دوسری چیز کا نام نہ لیجئے۔

حضرت عمران رضی اللہ عنہ کہنے لگے تم احمق آدمی ہو۔ ذرا یہ تو بتاؤ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ ظہر کے چار فرض ہیں اور ان میں جہراً نہیں پڑھنا چاہئے۔ پھر باقی نمازوں اور زکوٰۃ کا ذکر کر کے پوچھا کہ کتاب اللہ میں ان سب کی تفصیل مذکور ہے۔ سائل کے خاموش رہنے پر خود ہی فرمایا کہ کتاب اللہ نے ان کا حکم صادر کیا ہے اور حدیث نے ان کی تفصیل بیان کی (۲)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سنت رسول کے حد درجہ شیدائی تھے۔ ہر بات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو مرکز و محور سمجھتے تھے۔ جب حج و عمرہ کے لئے مدینہ طیبہ سے روانہ ہوتے تو جہاں رسول کریم نے پڑاؤ کیا تھا

۱- تاریخ الخلفاء ص۱۶۷۔

۳- جامع بیان العلم ج ۲ ص۱۹۱۔

علیہ وسلم نے جو کام یہاں کیا ابن عمر رضی اللہ عنہ بھی وہی کرتے۔

حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی رفاقت میں سرزمین روم کی ایک لڑائی میں شرکت کی۔ جناب عبادہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ دینار دے کر ان کے عوض سونا اور درہموں کے بدلے میں چاندی خرید رہے ہیں۔ فرمانے لگے لوگو تم سود کھا رہے ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ سونے کے عوض اگر سونا خریدنا چاہو تو برابر لیا دیا کرو۔ اس میں نہ مہلت ہو اور کمی بیشی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے میرے خیال میں سود تو صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے جب معاملہ نقد بہ نقد نہ ہو بلکہ ادھار ہو۔ یہ سن کر حضرت عبادہ نے فرمایا میں آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنا رہا ہوں اور آپ اپنی ذاتی رائے پیش کر رہے ہیں۔ اگر خدا مجھے اس لڑائی سے زندہ سلامت لے گیا تو جہاں آپ امیر ہوں گے میں اس سرزمین میں قیام نہیں کروں گا۔

جب اس لڑائی سے لوٹے تو مدینہ میں اقامت اختیار کر لی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس نقل مکانی کی وجہ پوچھی تو حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے پورا واقعہ بیان کیا۔ جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اپنے وطن لوٹ جائیے۔ جس سرزمین میں تمہارے جیسے لوگ نہ رہتے ہوں اس پر خدا کی پھٹکار ہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خط لکھا تم عبادہ رضی اللہ عنہ کے امیر نہیں ہو جو بات عبادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں لوگوں کو اس کی تعمیل پر آمادہ کیجئے۔ صحیح بات وہی ہے جو عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہی (۱)۔

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کا ایک نو عمر بھتیجا انگوٹھے پر کنکری رکھ کر اسے انگلی سے پھینک رہا تھا۔ انہوں نے دیکھ کر فرمایا بھتیجے یوں نہ کرو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ نہ اس سے شکار کیا جاسکتا ہے اور نہ دشمن کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ اتفاقاً کسی کو لگ جائے تو آنکھ پھوٹ جائے، دانت ٹوٹ جائے۔ بھتیجا کم عمر تھا۔ وہ چچا کو غافل دیکھ کر پھر کھیلنے لگا۔ انہوں نے دیکھ کر فرمایا میں تجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سناتا ہوں مگر تو پھر وہی کام کرتا ہے۔ خدا کی قسم میں تجھ سے کبھی بات نہیں کروں گا۔ نہ تیرے جنازہ میں شریک ہوں گا۔ نہ تیری عیادت کروں گا (۲)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنائی کہ عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت دے دیا کرو۔ ان کے ایک بیٹے نے عرض کیا کہ ہم تو اجازت نہیں دے سکتے وہ آگے چل کر فساد و آوارگی کا بہانہ بنا لیں گی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سناؤں اور تم کہو کہ اجازت نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لئے ان سے بولنا چھوڑ دیا (۳)۔

یہ تھے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم جنہیں ایک سنت کا ترک کرنا بھی گوارا نہ تھا۔ سنت کی موجودگی میں وہ کسی کی

۱- سنن ابن ماجہ۔ ج ۱۔ کتاب السنة باب تعظيم حديث رسول الله -

۲- ایضاً۔

۳- سنن ابن ماجه كتاب السنة. باب تعظيم حديث رسول الله -

حامی تھے۔ بنابریں احادیث نبوی کی حفاظت اوران کو پچھلے ادوار تک پہنچانے کا کریڈٹ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ہی کو ملنا چاہئے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو برا بھلا نہ کہو۔ اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ جتنا سونا بھی خرچ کرے تو ان کے گرد پا کو بھی نہیں پہنچ سکتا (۱)۔

بروایت حضرت عبداللہ بن مغفل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ میرے بعد ان کو نشانہ نہ بنانا۔ جس نے ان سے محبت کی اس نے میری ہی وجہ سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا اس سے میرے ساتھ بغض رکھنے کی وجہ سے ایسا کیا۔ جس نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایذاء دی اس نے مجھے رنج و الم پہنچایا اور جس نے مجھے دکھ دیا اس نے اللہ کو ستایا۔ اور جو شخص اللہ کو ستائے کچھ بعید نہیں کہ وہ اسے پکڑ لے (۲)۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے دین کی خاطر گھر بار چھوڑا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں جہاد کیا۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کیا اور اپنی جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ تحفظ احادیث کا فریضہ ادا کیا اور اس راہ میں پورے صدق و اخلاص کے ساتھ مالی اور جانی قربانیاں دیں۔

۱- مشکوۃ۔ باب مناقب الصحابہ رضی اللہ عنہم۔

۲- ایضاً۔

س ج م

آئمہ اربعہ کی نظر میں حدیث کا مقام

امام ابوحنیفہؒ اور حدیث نبوی

ان کا نام نعمان، کنیت ابوحنیفہ اور لقب امام اعظم ہے۔ ان کی پیدائش کوفہ کے ایک متمول گھرانے میں ہوئی۔ آپ عجمی النسل تھے۔ عام طور سے امام ابوحنیفہ کی شہرت وعظمت ان کی فقہ کی وجہ سے تھی لیکن ان کو علم حدیث کا بھی امام مانا جاتا ہے۔

ذیل میں سنت وحدیث کے بارے میں امام صاحب کے مستند اقوال پیش کیے جا رہے ہیں جن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ امام صاحب کے دل میں سنت وحدیث کی کتنی قدر ومنزلت تھی۔

"لولا السنة مافهم احد منا القران" (۱)۔

(اگر سنت کا وجود نہ ہوتا تو ہم میں سے کوئی بھی قرآن کا فہم حاصل نہ کرسکتا)۔

"اياكم والقول فى دين الله بالرأى وعليكم باتباع السنة فمن خرج عنها ضل" (۲)۔

(اللہ کے دین کے معاملہ میں رائے اور قیاس سے بچو اور سنت کی پیروی کو اپنے اوپر لازم کرلو۔ جو سنت کے دائرہ سے نکلا وہ گمراہ ہوا)۔

''جب صحیح حدیث موجود ہو تو میرا مذہب وہی ہے'' (۳)۔

امام حنیفہ کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے:

"اذا قلت قولا يخالف كتاب الله وحديث الرسول فاتركوا قولى"۔

(جب میں کوئی ایسی بات بیان کروں جو کتاب اللہ اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہو تو میری بات کو چھوڑ دو)۔

امام مالکؒ اور حدیث نبوی

امام مالک ۹۵ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔ ہوش وخرد کی منزل میں قدم رکھتے ہی ان کے کان علم سے آشنا ہونے لگے۔ اس وقت مدینہ میں علماء کا فیض جاری تھا۔ آپ نے ان سے فائدہ اٹھایا اور جلد ہی اس دور کے تمام علوم کو بدرجہ کمال حاصل کرلیا۔

۱- قواعد التحديث ص ۲۱ بحواله مقدمة الميزان للشعرانى ص۶۲۔

۲- قواعد التحدیث ص۲۳۔

۳- ایضاً۔

[illegible]

ان کا انتقال ہوا۔ آپ کو جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔

۱-''انما انا بشر اخطی واصیب فانظروا فی رأی فکل ما وافق الکتاب والسنة فخذوه وکل مالم یوافق الکتاب والسنة فاترکوه" (۱)۔

(میں ایک انسان ہی ہوں اور صحیح و غلط دونوں قسم کے فتویٰ دے سکتا ہوں۔ میری رائے میں غور کرو اگر کتاب و سنت کے مطابق ہو تو اسے قبول کرلو ورنہ رد کردو)۔

۲-''لیس احد الا ویوخذ من قوله ویترك الا النبی صلی الله علیه وسلم" (۲)۔

(ہر شخص کی بات کو اختیار بھی کیا جا سکتا ہے اور چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔ سوائے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو بہر حال اپنانا ہی پڑے گا)۔

امام شافعیؒ اور حدیث نبوی

نام و نسب محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع ہے۔ شافع کی جانب نسبت کر کے آپ کو شافعی کہا جاتا ہے۔ امام شافعی غزوہ کے مقام پر ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ ویسے تو امام شافعی کی اہمیت ان کے فقہ کی وجہ سے ہے لیکن فقہ کا دارومدار حدیث پر ہوتا ہے۔ اس لئے امام شافعی نے علم حدیث بھی حاصل کیا۔ وہ حدیث کے فن سے پوری طرح واقف تھے اور اصولی حیثیت سے اس پر گفتگو کرتے تھے۔ آپ کا ۵۴ سال کی عمر میں ۲۰۴ھ میں انتقال ہوا۔ مصر میں آپ کا مزار ہے۔

حدیث کے بارے میں امام شافعی کے بہت سے اقوال نقل کیے جا سکتے ہیں۔ بنظر اختصار یہاں صرف ان کا ایک قول بیان کیا جاتا ہے:

"اجمع المسلمون علی ان من استبان له سنة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم لم یحل له ان یدعها بقول احد" (۳)۔

(تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سامنے آجائے تو پھر اس بات کی گنجائش نہیں رہتی کہ اس کو کسی امتی کے قول کی بناء پر ترک کر دیا جائے)۔

امام احمد بن حنبلؒ اور حدیث نبوی

آپ جلیل القدر امام تھے۔ آپ کا نام احمد بن حنبل اور کنیت ابوعبداللہ ہے۔ آپ ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ امام

۱- جامع بیان العلم از ابن عبدالبر ج ۲ ص ۳۲۔

۲- عظمت حدیث ص ۲۹۱ بحوالہ اصول الاحکام ابن حزم ج ۶ ص ۱۳۵۔

۳- اعلام الموقعین ج ۲ ص ۳۶۱۔

احمد م حدیث کے ماہر تھے۔ [illegible]
غضب کی تھی۔ امام احمد اپنے علم وفضل کے اعتبار سے بڑی اہمیت کے مالک ہیں۔ یہ مسلمانوں کے چار بڑے فقہی مسلکوں میں سے ایک کے بانی ہیں۔ آپ ہر چیز کو قرآن وسنت کی روشنی میں دیکھتے تھے۔ آپ نے ۷۷ سال کی عمر میں ۲۴۱ھ میں وفات پائی۔ آپ لاتعداد اوصاف واخلاق کے مالک تھے۔ امام احمد بن حنبل کا احادیث کی جمع وترتیب اور درس وتدریس سے جو شغف رہا ہے اس کا انکار کس کو ہوسکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"من رد حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فهو على شفاهلكة" (۱)۔

(یعنی جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو رد کیا وہ ہلاکت وتباہی کے کنارے پر پہنچ گیا)۔

۱۔ عظمت حدیث ص۲۹۲ بحوالہ کتاب المناقب ابن الجوزی ص۱۸۲۔

باب دوئم

باب دوم

فصل اوّل:

حدیث کے بارے میں چند نظریات

فصل دوم:

مضمون کے لحاظ سے حدیث کی اقسام

فصل سوم:

فتنہ انکارِ حدیث

فصل چہارم:

برصغیر کے چند منکرین حدیث

فصل پنجم:

منکرین حدیث کے مراکز

فصل ششم:

فتنہ انکارِ حدیث کے رد میں لکھی جانے والی کتب

حدیث کے بارے میں چند نظریات

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں درج ذیل چند قسم کے نظریات یا خیالات پائے جاتے ہیں:

۱- ہر وہ بات جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی جائے خواہ اس کے راوی ثقہ ہوں یا نا قابل اعتماد اسے قبول کر لیا جائے۔

۲- دوسرا نظریہ یا طرزِ عمل یہ ہے کہ صرف قرآن کافی ہے۔ قرآن مجید میں تمام اصول و فروع اور کلیات و جزئیات موجود ہیں۔ لہذا قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔

سوچ کا یہ انداز پہلے طرز عمل کے بالکل برعکس ہے۔ قرآن مجید کے ساتھ ساتھ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی حجت ہے اور شریعت کا سر چشمہ ہے، لیکن اگر کوئی روایت (خبر واحد) قرآن مجید کے خلاف ہو یا عقل و قیاس کے منافی ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔ ایسی روایات جو قرآن کے اجمال کی تشریح کرتی ہوں یا ایسا حکم دیتی ہوں جس کے بارے میں قرآن خاموش ہے تو وہاں حدیث قبول کی جائے گی۔ لیکن قرآن نے اگر کوئی قاعدہ کلیہ یا عام حکم بیان کر دیا ہے تو حدیث کے ذریعے سے اس قاعدہ کلیہ کو یا اس حکم عام کو بدلا نہیں جا سکتا۔ یعنی کسی عام کی تخصیص یا کسی مطلق کی تقیید حدیث کے ذریعے نہیں ہو سکتی، مثلاً: قرآن میں حکم آ گیا ہے کہ زانی اور زانیہ کو سو کوڑے لگاؤ۔ اب اگر ان احادیث کو قبول کر لیا جائے جن میں شادی شدہ زانی مرد اور عورت کے لئے رجم کا حکم ہے تو اس سے قرآن کے حکم میں تبدیلی آ جائے گی۔ یہ صورت حال برداشت نہیں کی جا سکتی۔ یعنی سنت کی کہاں مجال کہ وہ قرآن کے حکم کو بدل دے۔

قرآن مجید کے ساتھ ساتھ تعامل امت اور سنت متواترہ کو حجت مانا جائے اور خبر واحد پر اعتماد نہ کیا جائے۔

۳- ایک خیال یہ ہے کہ ایسا عالم دین جو قرآن مجید اور سنت کے گہرے مطالعہ سے مزاج شناس رسول بن جاتا ہے تو وہ ضعیف اور منقطع روایات میں ہیرے کی جوت دیکھ لیتا ہے تو اس بناء پر وہ صحیح الاسناد حدیث کے مقابلے میں ضعیف روایات کو ترجیح دیتا ہے۔'' یعنی محدث کے فیصلے کے مقابلے میں مجتہد فقیہ کی رائے مقدم ہو گی (۱)۔

جو احادیث صحیح اسناد کے ساتھ منقول ہیں ان کو قبول کیا جائے اور کوئی ایسی روایت جس کی سند صحیح ہو قرآن مجید یا قیاس و عقل کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ خاص طور پر وہ روایات جن کا تعلق عملی زندگی سے ہو۔ ایسی روایات کو قبول کرنا ضروری ہے، لیکن ایسی روایات جن کا تعلق فضائل و مناقب سے ہے ایسی روایات یا ترغیب و ترہیب پر مشتمل ہوں ان کے بارے میں کوئی صحیح تاویل نہ ہو سکے تو توقف کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ دیکھئے تفہیمات از مولانا مودودی ج ۱ ص ۳۲۳، ۳۲۴

"اذا جاء الحلال والحرام، شددنا فی الأسانيد واذا جاء الترغيب والترهيب تساهلنا فی الأسانيد"(۱)۔

(ہم حلال وحرام سے متعلق احادیث قبول کرنے میں اسانید کی خوب جانچ پڑتال کرتے ہیں۔یعنی تنقید کا معیار اونچا رکھتے ہیں اور جب ترغیب وترھیب کا معاملہ ہوتو اسناد کے بارے میں نرمی برتتے ہیں)۔

اس سے معلوم ہوا کہ فقہی اور عملی مسائل میں کوئی ایسی روایت نہیں ملتی جو صحیح بھی ہو اور اس کے باوجود وہ قرآن یا عقل وقیاس کے منافی ہو، کیونکہ محدثین کرام نے حلال وحرام سے متعلق احادیث کے پرکھنے میں بہت زیادہ چھان بین کی ہے اور تحقیق اور جرح وتعدیل کا بہت ہی اونچا معیار قائم کیا ہے۔

ان چاروں نظریات اور مسالک میں سے یہ آخری نظریہ دلائل کے لحاظ سے قوی ہے۔ پہلا نظریہ یا طرزِ عمل انتہائی غلط ہے جس کی بنیاد پر بہت سی بدعات اور غلط قسم کے عقائد مسلم معاشرے میں رواج پا گئے ہیں۔ ہر قسم کی روایات کا قبول کر لینا واعظین فقہا مؤرخین، عام مفسرین اور اصحاب تصوف کا شیوہ رہا ہے۔جیسا کہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرمایا ہے:

ههنا طبقه خامسة منها: مااشتهر على ألسنة الفقهاء والصوفية والمؤرخين ونحوهم، و ليس له أصل فی هذا الطبقات الأربع، ومنها مادسه الماجن فی دينه العالم بلسانه، فأتی باسناد قوی لايمكن الجرح فيه، وكلام بليغ لايبعد صدوره عنه صلى الله عليه وسلم فأثار فی الاسلام مصيبة عظيمة، لكن اللجهابذة من أهل الحديث يوردون مثل ذلك على المتابعات والشواهد فتهتك الأستار ويظهر العوار (۲)۔

اب یہاں ایک پانچواں طبقہ ہے۔اس طبقہ کی احادیث وہ ہیں جو فقہاء،صوفیاء اور مؤرخین وغیرہ کی زبانوں پر مشہور ہیں،مگر ان چاروں طبقات میں ان کی کوئی اصل موجود نہیں ہے۔اس طبقہ میں ایسی روایات بھی پائی جاتی ہیں جنہیں بے دین اہل زبان لوگوں نے اختراع کیا ہے اور انہیں ایسی قوی اسناد سے بیان کیا ہے جن پر جرح نہیں کی جاسکتی اور ایسے بلیغ کلام سے روایت کیا جس کا صدور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بعید نہیں ہے۔ یوں ان لوگوں نے اسلام میں بڑی آفت برپا کی۔مگر ماہر علماءِ حدیث ایسی روایات کو متابعات وشواہد پر پرکھتے ہیں تو پردے کھل جاتے ہیں اور عیب ظاہر ہو جاتا ہے۔

اسی طرح طبقہ رابعہ کی کتب حدیث کی حیثیت ہے۔اس طبقہ کی کتابوں میں ان کے مصنفین نے بہت سی موضوع

۱- علم الحدیث از ابن تیمیہ ص۵۵۔

۲- حجۃ اللہ البالغہ از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ص۱۰۷ طبع الاولی ۱۳۲۲ھ۔

[illegible]
ہیں۔

حدیث کے بارے میں پہلا نظریہ یا طرزِ عمل ایسا ہے کہ جس سے اصل دین کا حلیہ ہی بگڑ جاتا ہے۔ یہ ایک انتہاء ہے جس کو غلو اور افراط سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا نظریہ یہ ہے کہ تمام احادیث کو لغو قرار دے کر دریا بُرد کر دیا جائے۔ اس کا نام تفریط ہے۔ یہ حدیث سے عداوت میں غلو ہے اور پہلا طرزِ عمل عقیدت و محبت میں غلو ہے۔ اس لئے یہ دونوں نظریے یا خیالات مکمل طور پر مسترد کرنے کے قابل ہیں۔ پہلے خیال سے بدعات اور شخصیت پرستی کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے خیال سے کفر والحاد اور شکوک وشبہات کا دروازہ کھلتا ہے۔ باقی رہی نظریہ حدیث کی تیسری قسم تو اس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص یا گروہ چند اخبار احاد کو اس بناء پر رد کر دیتا ہے کہ وہ قرآن یا عقل وقیاس کے خلاف ہیں تو ایسے افراد کی نہ تکفیر کی جاسکتی ہے اور نہ ہی انہیں فاسق قرار دیا جاسکتا ہے۔ اُس کی دلیل یہ ہے کہ ایک سے زیادہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے بعض صحیح اخبار کو قبول نہیں کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فاطمہ بنت قیس کی روایت کو رد کر دیا جس میں ایسی عورت کے لئے نفقہ ساقط کیا گیا ہے جس کو تین طلاقیں ملی ہیں اور جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایات کو رد کر دیا جس میں بتایا گیا ہے کہ ''میت کو اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے۔''

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں سے کوئی روایت ایسی نہیں ہے جو قرآن کے مخالف ہو اور نہ کوئی ایسی حدیث ہے کہ جو عقل صریح کے منافی ہو بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات قرآن کا بیان اور اس کی تفسیر ہیں اور جو احکام قرآن میں اجمال واختصار کے ساتھ بیان ہوئے ہیں ان کی تفصیل وتشریح احادیث میں ملتی ہے۔ ہر وہ حدیث جس کو کسی نے اس خیال سے رد کر دیا ہے کہ وہ قرآن کے مخالف ہے تو واقعہ یہ ہے کہ وہ قرآن کے مطابق اور موافق ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ حدیث قرآن سے زائد حکم بیان کرتی ہے اور یہ حدیث کی وہ قسم ہے جس کے قبول کرنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے اور اس کے رد کرنے سے منع کیا ہے (۱)۔

۱- عظمت حدیث از مولانا عبدالغفار حسن رحمانی ص ۴۸ بحوالہ الصواعق المرسلۃ ج ۲ ص ۵۲۹

مضمون کے لحاظ سے حدیث کی اقسام

پہلی قسم

ایسی احادیث جو قرآنی آیات سے ملتے جلتے مضامین پر مشتمل ہیں۔ بنیادی عقائد و اخلاق پر مشتمل بہت سی احادیث اسی نوع میں شمار ہوتی ہیں۔ اس قسم کی روایات قرآن مجید سے صرف الفاظ میں مختلف ہوتی ہیں۔ معنوی لحاظ سے دونوں میں پوری مطابقت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس طرح کی بے شمار روایات میں سے صرف ایک حدیث بطور مثال پیش کی جاتی ہے:

عن عبدالله بن مسعود قال قال رجل يا رسول الله أى الذنب أكبر عندالله قال ان تدعوالله نداوهو خلقك قال ثم أى قال أن تقتل ولدك خشية أن يطعم معك، قال ثم أى قال أن تزنى حليلة جارك فانزل الله تصديقها - وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ وَلَايَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَايَزْنُوْنَ (۱)۔

(ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے سوال کیا، اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے بڑا گناہ کون سا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کے لئے شریک (ہم پلہ) ٹھہراؤ'' اس نے پوچھا ''پھر کون سا گناہ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس اندیشے سے قتل کر ڈالو وہ تمہارے ساتھ کھانے میں شریک ہوگی۔'' اس نے سوال کیا ''پھر کون سا گناہ؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرو۔'' ان ارشادات کی تصدیق و تائید میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی'' رحمان کے بندے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرا معبود نہیں پکارتے اور نہ اس جان کو قتل کرتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے حرمت والا ٹھہرایا ہے۔ الا یہ کہ کسی حق کی بنیاد پر اس کا قتل جائز ہو اور نہ وہ بدکاری کرتے ہیں)۔

سورہ بنی اسرائیل میں قتل اولاد کے سلسلے میں فرمایا:

﴿وَلَاتَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ﴾ (بنی اسرائیل (۱۷):۳۱)۔

یعنی اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ مشکوٰۃ کتاب الایمان اور کتاب النفاق والکبائر میں اس نوع کی متعدد احادیث ملتی ہیں جو اجمال و تفصیل میں قرآن سے یکساں مطابقت رکھتی ہیں۔

دوسری قسم

ایسی احادیث جن میں قرآن سے زائد مضمون ملتا ہے۔ اس کی چند شکلیں ہیں:

۱- مشكوة باب الكبائر وعلامات النفاق۔

الف۔قرآنی اجمال کی تفصیل وتشریح

مثلاً قرآن میں ہے:

﴿اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوالزَّکٰوۃَ﴾ (نساء(۴):۷۷)۔

(نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو)۔

﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا﴾ (النساء(۴):۱۰۳)۔

(نماز مومنوں پر مقررہ اوقات میں ادا کرنا فرض ہے)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز متعین اوقات میں ادا کرنی ضروری ہے۔لیکن اوقات کی پوری تفصیل اور حد بندی حدیث سے واضح ہوتی ہے۔

ب۔معنی مقصود کی تعیین

﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَاتَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ﴾ (البقرہ(۲):۲۳۰)۔

(پھر بھی اگر طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہوتی جب تک ایک اور خاوند سے نکاح نہ کرے)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری طلاق کے بعد بیوی شوہر پر حرام ہو جاتی ہے۔اب وہ از سرِ نو نکاح کر کے بھی اسے اپنے گھر میں آباد نہیں کر سکتا۔ ہاں صرف اس صورت میں جبکہ کسی دوسرے شخص سے وہ نکاح کر لے۔اب اگر یہ دوسرا شوہر اس کو طلاق دے دے تو پھر پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔اس آیت میں نکاح کے معنی صرف ایجاب وقبول کے نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد جنسی تعلق بھی ہے۔یہ تعیین وتوضیح حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔اسی قسم کے واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت سے فرمایا تھا ''حتی تذوقی عسیلته ویذوق عسیلتك'' (۱)۔

یعنی محض نکاح (ایجاب وقبول) ہی کافی نہیں ہے بلکہ جنسی تعلق سے عہدہ برآ ہونا بھی ضروری ہے۔

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰیٓ O اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی﴾ (عبس(۸۰):۲)۔

''پیشانی پر بل ڈالے اور رخ پھیر لیا۔اس بنا پر کہ اس کے پاس نابینا آیا تھا''۔

قرآن مجید سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ پیشانی پر بل کس نے ڈالے اور یہ آنے والا نابینا شخص کون تھا۔اس آیت کا پورا پس منظر حدیث ہی سے معلوم ہوتا ہے۔

﴿اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَکُمْ﴾ (المائدہ(۵):۶)۔

(اور جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو اپنے چہرے دھولو)۔

اس آیت میں وضو کا حکم دیا گیا ہے۔آیت کے الفاظ عام ہیں۔خواہ انسان پہلے سے باوضو ہو یا بے وضو۔بظاہر ان دونوں ہی حالتوں میں اس پر وضو فرض کیا گیا ہے۔لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ باوضو شخص کے لئے تجدید وضو

۱۔ مشکوٰۃ ج ۲۔باب المطلقہ ثلاثا۔

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ (المائدہ (۵): ۳) (تم پر مردار حرام کر دیا گیا ہے)۔

مردار کا لفظ عام ہے۔ ہر نوع کے مردے کو شامل ہے۔ لیکن شریعت اسلامیہ مردہ مچھلی اور ٹڈی کو حلال ٹھہراتی ہے۔ یہ تخصیص واستثناء حدیث ہی کی بنیاد پر عمل میں آیا ہے۔

تیسری قسم

سرمایہ سنت کی تیسری قسم وہ ہے جو قرآن سے زائد ہے اور قرآن اس بارے میں بظاہر خاموش ہے۔ سنت سے ثابت شدہ اس طرح کے احکام کے بارے میں یہ کہنا اپنی جگہ درست ہوگا کہ ان کی کوئی نہ کوئی اصل قرآن میں ضرور پائی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں اس کا علم نہ ہو سکے۔ بلکہ سنت سے ثابت بعض احکام ایسے بھی ملتے ہیں جو قرآن کے ظاہری الفاظ کے مخالف ہوتے ہیں لیکن تعامل امت بتلاتا ہے کہ کسی قابل ذکر گروہ یا فرقے نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے۔ مثلاً: قرآن مجید نے سکھائے ہوئے، سدھائے ہوئے شکاری کتے کا شکار حلال ٹھہرایا ہے (۱)۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتا باقاعدہ شکار کے لئے تربیت یافتہ نہ ہو تو اس کا شکار حلال نہیں ہے۔ اب ایک صورت یہ باقی رہ جاتی ہے کہ اگر تربیت یافتہ کتا شکار میں سے کچھ کھالے تو یہ شکار حلال ہوگا یا نہیں؟ اس بارے میں کوئی واضح ضابطہ قرآن میں نہیں ملتا۔ لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکار بھی حرام ہے (۲)۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم کے لئے مطلقاً شکار ممنوع ہے اور جو عمداً شکار کرے اس پر جزاء واجب ہے (۳)۔ لیکن جو احرام میں غلطی سے شکار کر ڈالے اس کی جزاء کی نوعیت کیا ہوگی؟ اس سے قرآن خاموش ہے لیکن حدیث نے اس کو واضح کیا ہے کہ عمداً اور خطأً دونوں صورتیں جزاء کے لحاظ سے یکساں ہیں۔

﴿وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ﴾ (النساء (۴): ۲۳)۔

(دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا تمہارے اوپر حرام کر دیا گیا ہے)۔

لیکن حدیث اسی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ خالہ اور بھانجی، پھوپھی اور بھتیجی کو بھی بیک وقت نکاح میں رکھنے سے روکتی ہے۔ بظاہر اس اضافے کی کوئی بنیاد قرآن میں نہیں ملتی لیکن اگر (وأن تجمعوا بين الاختين) کی علت پر غور کیا جائے تو قرآن ہی سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی اصل بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ یعنی دو بہنوں کو سوکنوں کی شکل میں رکھنا ان کے رشتہ اخوت کو قطع کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہی علت خالہ، بھانجی، پھوپھی، بھتیجی کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنے میں ممانعت پائی جاتی ہے۔ اس کی توضیح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دوسرے موقع پر فرما دی ہے۔ اور

۱- المائدہ (۵) ۶۔

۲- مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح۔

۳- المائدہ (۵) ۹۶۔

بہن (۲)۔لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ بھی متعدد رشتے رضاعت کی بناء پر حرام ہیں۔قرآن مجید میں ایک واضح اصول کے ماتحت نواقض وضو کا ذکر کیا گیا ہے۔سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ نینداور دبر سے خارج شدہ ریح بھی نواقض وضو میں شامل ہے۔قرآن نے خمر کو حرام ٹھہرایا ہے۔لفظ خمر سے بظاہر شراب کی اتنی ہی مقدار کی حرمت ثابت ہوئی ہے جونشہ آور ہولیکن حدیث نے مزید بتایا مااسکر کثیرہ فقلیلہ حرام (۳)۔جس مشروب کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو اس کا ایک قطرہ بھی حرام ہے۔اب چند مثالیں ایسی بیان کی جاتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ حدیث یا اجماعِ امت کی بناء پر قرآن کا ظاہر مفہوم ترک کر دیا جاتا ہے مثلاً ﴿وَرَبَآئِبُكُمُ الّتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ﴾ (نساء(۴):۲۳)۔

تم پروہ ربیبہ (۴) لڑکیاں حرام ہیں جو تمہاری نگرانی میں پرورش پارہی ہوں۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ربائب بہرصورت حرام ہیں خواہ وہ زیر پرورش ہوں یا نہ ہوں۔اس آیت میں فی حجورکم کی قید محض اظہارِ واقعہ کے لئے ہے، کسی قانونی پابندی کے اضافہ کے لئے نہیں ہے (۵)۔

﴿فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ (اگر تمہیں خوف ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے تو تم پر گناہ نہیں اگر نماز میں اختصار کرو)۔(نساء(۴):۱۰۱)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن سے خوف کی حالت ہی میں نماز قصر کی جاسکتی ہے۔بلکہ بعض آئمہ کرام کے نزدیک حالت سفر میں قصر واجب ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی (البقرہ(۲):۱۷۸)۔

(اے ایمان والو تم پر قصاص لازم کیا گیا ہے۔آزاد آزاد کے بدلے، غلام غلام کے بدلے، عورت عورت کے بدلے(۶)۔

اس آیت کے ظاہر الفاظ سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کو قتل کر ڈالے تو وہ قصاص میں قتل نہیں کیا جاسکتا۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں تمام مسلمان یکساں ہیں تتکافادماۂھم اس عورت کے بدلے مرد قتل کیا جائے گا (۶)۔

۱- الموافقات، شاطبی ج ۳ص ۱۹۲۔

۲- مشکوۃ ج ۲ باب المحرمات ۔

۳- مشکوۃ باب بیان الخمر ۔

۴- وہ لڑکیاں جو عورت کے پہلے خاوند سے ہوں، دوسرے خاوند کے لئے وہ ربائب کہلائیں گی۔

۵- تفسیر ابن کثیر ج۱ص ۴۷۱۔

۶- تفسیر ابن کثیر ج۱ص ۲۱۰۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا (البقرہ(۲):۱۵۹)۔

(بے شک صفا مروہ پہاڑیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جس نے حج یا عمرہ کیا تو اس پر کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے۔

اس آیت سے بظاہر صفا اور مروہ کے طواف (سعی) کا جواز معلوم ہوتا ہے یعنی اگر کوئی ایسا کرے تو کسی قسم کا گناہ لازم نہ آئے گا لیکن حدیث میں جو اس آیت کا پس منظر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفا و مروہ کا طواف واجب ہے۔(۱)

﴿وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا﴾ (نور(۲۴):۳۳)۔

(اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو اگر وہ عفت و پاکبازی کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں)۔

ان اردن تحصنا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر وہ لونڈیاں عصمت و پاک دامنی کی بجائے کسی اور وجہ سے بدکاری پر آمادہ نہ ہوں تو ان کو اس پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ حدیث میں اس آیت کا جو شان نزول بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اردن تحصنا کی قید اتفاقی یعنی اظہارِ واقعہ کے لئے احترازی نہیں ہے(۲)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ احادیث اپنے مطالب و مضامین کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہے:

۱۔ قرآن کے مترادف (ہم معنی)۔

۲۔ قرآن سے زائد یعنی اس کے اجمال کی تفصیل یا عموم کی تخصیص وغیرہ۔

۳۔ ایک الگ حکم کا اثبات جس سے بظاہر قرآن ساکت ہے بلکہ بعض مواقع پر قرآن کا ظاہری مفہوم حدیث سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ اب اگر قرآن سے عدم تصادم اور عدم مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ صرف پہلی قسم کی احادیث کو قبول کیا جائے۔ باقی دونوں قسموں کو رد کر دیا جائے تو اس طرح کا خیال امت کے متفقہ تعامل کے یکسر خلاف ہے۔ اس متفقہ تعامل کو قرآن نے سبیل المومنین قرار دیا ہے اور اس سے انحراف پر عذاب جہنم کی شدید وعید سنائی ہے۔ اگر پہلی قسم کی احادیث ہی کو قبول کیا جائے تو یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

الف۔ ایک یہ کہ پہلی قسم کی احادیث تو قرآن کے ہم معنی ہیں ان کے قبول یا عدم قبول سے دینی معلومات میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہر حال اس تکلیف کی ضرورت ہی کیا ہے۔

ب۔ دوسرے یہ کہ دوسری اور تیسری قسم کی روایات کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو قرآن کا صحیح مفہوم ہی پراگندہ ہو کر رہ جائے گا اور نئے نئے مفسرین جب سنت سے بے نیاز ہو کر قرآن کی تفسیر کریں گے تو امت کی وحدت پارہ پارہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔ مذکورہ بالا شواہد و نظائر سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۱ ص ۱۹۹ بحوالہ بخاری و مسلم۔

۲۔ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۸۹۔

فصل سوم

فتنہ انکار حدیث

کلام پاک میں لفظ فتنہ متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے اور بہت سی چیزوں کو مختلف پہلوؤں سے فتنہ قرار دیا گیا ہے۔لغت کی اہم ترین کتاب ''لسان العرب'' کی رو سے فتنہ کے معنی آزمانے اور پرکھنے کے بھی ہیں (۱)۔اس لئے ہر وہ چیز جو انسان کی عقل اور اس کے عزائم کے لئے وجہ امتحان اور آزمائش ہو، فتنہ ہے۔دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ وہ تمام چیزیں جو انسان کی عقل وضمیر اور اس کے عزم واستقامت میں ضعف کا باعث ہوں اور جن کی بناء پر حق وصداقت کی راہ پر قائم رہنا دشوار ہو جائے، فتنہ ہیں۔اسی معنی کے اعتبار سے مال ودولت بھی فتنہ ہے۔کیونکہ اس کی فراوانی میں کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا عقلی توازن ٹھیک رہتا ہے۔فقر وفاقہ بھی فتنہ ہے۔اس لئے کہ اس سے دوچار ہونے کی صورت میں بہت کم ایسے نکلتے ہیں کہ راہِ حق پر جن کا قدم استوار رہتا ہو۔اور وہ خدا کی مرضی پر صابر وشاکر رہتے ہوں اور جائز وناجائز کی تمیز ترک نہ کر دیتے ہوں۔عہدہ ومنصب بھی فتنہ ہے کہ اس سے غرور پیدا ہوتا ہے۔عہدہ دار اپنے کو خادم کی بجائے مخدوم سمجھنے لگتا ہے۔اولاد بھی فتنہ ہے۔کیونکہ اس کے آرام وراحت کے لئے انسان جائز وناجائز کی حدود توڑ دیتا ہے۔بیوی بھی فتنہ ہے کہ اس کی محبت بسا اوقات صحیح نصب العین سے انحراف کا باعث ہوتی ہے۔کسی صحیح مسلک اور عقیدہ سے پھیرنے کے لئے جبر وتشدد برتنا بھی فتنہ ہے۔کیونکہ اس میں اہل حق کی حق پرستی اور عزیمت کا کھلا ہوا امتحان ہے۔کافر کی خوشحالی بھی فتنہ ہے کہ یہ صورت حال مومن کے لئے بڑی وجہ ابتلاء ہے۔منافق کی وہ تدبیر اور روش بھی فتنہ ہے جو اہل حق کے خلاف وہ عمل میں لاتا ہے کیونکہ اس سے حق پرستوں کی آزمائش شدید سے شدید تر ہو جاتی ہے (۲)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے آج سے بہت پہلے انکار حدیث کے فتنہ کی خبر واضح الفاظ میں دے دی تھی کہ ایسے لوگ خوشحال، عیش وعشرت سے مالا مال اور ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی گزارتے ہوں گے کہ ان کے حال مقام دونوں کا نقشہ اس انداز سے کھینچا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کو پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی۔یہ اسی قسم کی پیش گوئی ہے جیسا کہ آپ نے اپنے بعد جھوٹے مدعیان نبوت کے ظہور کی خبر دی تھی اور وہ حرف بحرف سچی نکلی۔

عن أبی رافع و مولی رسول الله صلی الله علیه وسلم ، قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لاالفین احدکم متکئا علی اریکته یاتیه الامر من امری مما امرت به اونهیت عنه فیقول لاادری ما وجدناه فی کتاب الله اتبعناه (۳)

ابورافع سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ

۱- لسان العرب از امام علامہ ابن منظور ص ۱۷۸۔

۲- فتنہ پرویز وحقیقت حدیث (ایم عبدالرحمٰن خان) ص ۱۲ بحوالہ معارف ج ۴ ص ۲۸۸۔

۳- جامع الترمذی باب العلم۔

اپنی مسہری پر ٹیک لگائے بیٹھا ہو۔ اس کے پاس جب میرے احکام میں سے کوئی حکم پہنچے گا تو وہ کہے گا کہ میں اس امر کو نہیں جانتا۔ ہم نے جو کتاب اللہ میں پایا ہے اسی کی اتباع کرتے ہیں۔

عن المقدام بن معد يكرب قال قال رسول الله الا انى اوتيت القرآن ومثله معه۔ الا يوشك رجل شبعان على اريكتهٖ يقول عليكم بهذا القرأن فما وجدتم فيه من حلال فاحلوه وماوجدتم فيه من حرام فحرموه۔ وان ماحرم رسول الله كما حرم الله الا لايحل لكم الحمارُ الاَهلى وَلَاكُلَّ ذِى نابٍ من السباع (۱)۔

مقدام بن معدی یکرب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سنو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کے مثل بھی سنو! قریب ہے کہ ایک پیٹ بھرا شخص آسودہ حال شخص اپنی مسہری پر بیٹھ کر کہے گا اس قرآن کو لازم پکڑ لو۔ جو تم اس میں حلال پاؤ اسے حلال قرار دو اور جسے تم حرام پاؤ حرام ٹھہراؤ۔ سنو! پالتو گدھا حلال نہیں ہے اور نہ درندے حلال ہیں (۲)۔

اسلام میں تقریباً پہلی صدی تک صحیح احادیث کو بلا تفصیل متفقہ طور پر حجت سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ معتزلہ ظاہر ہوئے ان کے دماغوں پر عقل کا غلبہ تھا۔ انہوں نے حشر ونشر، رویت باری تعالیٰ، صراط، میزان جنت وجہنم اور اس قسم کی احادیث کو قابل تسلیم نہ سمجھا اور اپنے مخصوص مزاج اور رویہ کی وجہ سے اخبار متواترہ کے علاوہ بقیہ احادیث کا سرے سے انکار کر دیا اور بہت سی قرآنی آیات جو اپنے ذوق و مذاق کے خلاف دیکھیں تاویلیں کر ڈالیں۔ حافظ ابن حزم اندلسی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''اہل سنت، خوارج، شیعہ، قدریہ اور دیگر تمام فرقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث کو جو ثقہ راویوں سے منقول ہوں برابر قابل حجت سمجھتے رہے۔ یہاں تک کہ پہلی صدی ہجری کے بعد متکلمین معتزلہ آئے اور انہوں نے اس اجماع کے خلاف کیا'' (۳)۔

معتزلین

واصل بن عطاء کا (۸۰ھ-۱۳۱ھ) میں ظہور ہوا۔ مشہور یہ ہے کہ واصل بن عطاء حضرت حسن بصری (م ۱۰۰ھ) کے درس میں بیٹھا ہوا تھا، اس کا حسن بصری سے یہ اختلاف ہوا کہ آیا گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن ہی رہتا ہے (جیسے مرجیہ کا خیال تھا) یا کافر ہو جاتا ہے (جیسا کہ خوارج کہتے تھے)۔ حضرت حسن بصریؒ کا یہ خیال تھا کہ وہ منافق ہوتا ہے۔ واصل بن عطاء نے اس مسئلہ میں ان سے اختلاف کیا اور اپنے ہمنوا ساتھیوں کو لے کر آپ کے حلقہ درس سے اٹھ کر مسجد کے کسی دوسرے کونے میں الگ جا بیٹھا تو حسن بصریؒ نے کہا کہ "اعتزل عنا" یعنی ہم سے کنارہ کر گیا ہے (۴)۔

۱- سنن ابی داؤد باب السنة۔ ابن ماجه باب السنه ۔

۲- سنن ابی داؤد۔ باب السنة ۔

۳- الاحکام فی اصول الاحکام ج۱ص۱۱۴۔

۴- آئینہ پرویزیت ص۵۱۔

[illegible]

اعتزال کے نام سے مشہور ہوا۔

جب ہارون الرشید کے عہد میں یونانی فلسفہ کے تراجم عربی زبان میں شائع ہوئے تو یہ خیالات عام مسلمانوں تک پہنچے تو اس کے نتیجہ میں مسلمانوں میں دو قسم کے گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک گروہ وہ تھا جس نے قرآن وسنت کے مقابلہ میں ارسطو کے نظریات الٰہیہ کو کلیتاً رد کر دیا۔ دوسرا گروہ ان ذہین فطین لوگوں کا تھا جس نے محض اس بات پر ہی اکتفا نہ کیا کہ یونانی فلسفہ کو رد کر دیا جائے بلکہ انہوں نے عام مسلمانوں کو اس یونانی فلسفہ کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی خاطر فلسفہ کا جواب عقلی دلائل سے پیش کیا اور علم الکلام کی طرح ڈالی۔ ایسے لوگوں میں امام احمد بن حنبل (م ۲۴۶ھ)، امام بخاری (م ۲۵۶ھ) امام غزالی امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم رحمہ اللہ وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ متاخرین میں شاہ ولی اللہ نے ایسی ہی خدمات سرانجام دیں۔

معتزلہ کے عقائد ونظریات

''اہل عدل'' کے لفظ سے وہ اپنے مخصوص عقیدہ کی وضاحت کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ انسان اپنے اعمال و افعال میں خود مختار ہے۔ باری تعالیٰ بس ان افعال کا خاموش تماشائی ہے۔ اس کی بلند ذات انسان سے معاملات میں دخیل ہونا پسند نہیں کرتی۔ انسان جس طرح اس طبعی دنیا میں قوانین طبعی کا پابند ہے اگر وہ آگ میں ہاتھ ڈالتا ہے تو ہاتھ کا جلنا ناگزیر ہے بعینہ اسی طرح اسے اپنے برے اعمال کا عذاب یا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ اگر انسانی اعمال میں اللہ کو دخیل مان لیا جائے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کا محاسبہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے(۱)۔ اسی طرح اگر انسانی اعمال کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ ومنشاء کے تابع قرار دیا جائے تو پھر انسانوں کو عذاب دینا معاذ اللہ ظلم کا ارتکاب ہے۔ جس سے وہ ذات پاک ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے عدل کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے افعال واعمال میں پوری طرح خود مختار رہے۔ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں دوسری دلیل یہ پیش کرتے تھے کہ اگر انسانی اعمال اللہ کی مرضی کے تابع ہوں اور انسان مجبور محض ہو تو پھر اسے انبیاء کو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟

اسلام میں جب بھی کسی گروہ نے اپنے تصورات ونظریات کو داخل کرنا چاہا تو اس نے سب سے پہلے عقل کی برتری اور اس کی فرمانروائی کا چرچا کیا اور کہا کہ چونکہ مروجہ نظریات وخیالات وافکار ذہن انسانی سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس لئے انہیں رد کر کے اس کی جگہ ایسے افکار ونظریات لانا ضروری ہے جو عقل کے عین مطابق ہوں۔ عقل سے مراد وہ نظریات ہوتے ہیں جو اس دور کے غالب رجحانات کی عکاسی کریں۔ معتزلہ نے بھی یونانی افکار ونظریات سے ذہنی طور پر شکست کھا کر یہی کچھ کیا اور عقل کی بناء پر زور دیا کہ شریعت میں فیصلہ کن حیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے عقل کو حاصل ہو اور انہیں وہ سارے اعمال وتصورات شریعت سے خارج کرنے میں آسانی رہے۔ جو ان کے زعم کے مطابق

۱- ملاحظہ ہو معتزلہ کی تاریخ از زہدی حسن جاراللہ ص ۱۵۲۔

ساری احادیث کو رد کر دیا جن میں ان کا ثبوت تھا۔ عقل کی برتری اور تفوق ان کے عقیدہ کا جزو لاینفک تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے اجتناب کا حکم دیا ہے وہ فی نفسہٖ بری اور انسان کی نظروں میں ناپسندیدہ ہیں۔ اسی طرح جن چیزوں کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ اس لئے ہے کہ وہ چیزیں فی نفسہٖ اچھی ہیں اور انسانی عقل انہیں پسند کرتی ہے (۱)۔

''اہل توحید'' کے لفظ سے معتزلہ اپنے اس مخصوص عقیدے کی وضاحت کرتے تھے جو ارسطو نے پیش کیا تھا اور بڑے طمطراق سے یہ دعوے کرتے تھے کہ وہ توحید خالص کے قائل ہیں اور باری تعالیٰ کو ہر قسم کے شرک سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ باری تعالیٰ یکتا ہے، قدیم ہے۔ اس معاملے میں کوئی دوسری صفت یا چیز اس کی شریک و سہیم نہیں اور اگر اس کی صفات بھی اسی کی طرح ازلی و ابدی مان لی جائیں تو تثبیت قدماء لازم آتی ہے جو شرک ہے۔ چنانچہ یہ لوگ خدا کی صفات مثلاً علم قدرت، حیات، سمع و بصر وغیرہ کو اس معنی میں مانتے تھے کہ وہ فی ذاتہٖ حی سمیع و بصیر ہے۔ اس کی کوئی صفت اس کی ذات پر الگ یا زائد نہیں (۲)۔

معتزلہ کے یہ عقائد ہر چند گمراہ کن تھے اور مسلمانوں کی اکثریت نے ان کو مردود قرار دے دیا تھا تاہم ایک وجہ ایسی پیدا ہوگئی جو معتزلہ کی شہرت دوام کا باعث بن گئی۔ عباسی خلیفہ منصور (۱۳۶-۱۵۸ھ) واصل بن عطاء سے متاثر تھا۔ اس لئے واصل بن عطاء کو بڑا بلند مرتبہ حاصل تھا۔ تاہم خلیفہ منصور نے یہ خیالات اور عقائد اپنی ذات تک محدود رکھے اور ان کو رعایا پر ٹھونسنے کی کوشش نہ کی۔ یہ عقائد عباسی خلفاء میں پرورش پاتے رہے۔ ہوتے ہوتے جب مامون الرشید کا دور (۱۹۸ تا ۲۱۸ھ) آیا تو ان عقائد نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ کیونکہ مامون خود پکا معتزلی تھا اور اس نے یہ عقائد بہ جبر مسلمانوں پر ٹھونسنے کی کوشش کی۔

خلق قرآن کے مسئلہ میں مامون الرشید عام معتزلین سے بھی چار قدم آگے بڑھ گیا تھا۔ مامون الرشید نے حکم دیا کہ جو لوگ قرآن کو مخلوق نہ مانیں انہیں فوراً گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دیا جائے۔

یہ فرمان شاہی سن کر کم و بیش سب علماء نے اپنی جان بچانے کی خاطر قرآن کو مخلوق کہہ دیا۔ صرف چار علماء امام احمد بن حنبل، محمد بن نوح، قواریزی وغیرہ اپنے اصلی مسلک پر قائم رہے (۳)۔

یہ دور امام احمد بن حنبل پر ابتلاء کا دور تھا۔ آپ کو کئی بار کوڑوں سے پیٹا گیا۔ امام صاحب کی سزا اور موت کا مسئلہ دراصل ان کی ذات تک محدود نہ تھا۔ عوام الناس کو امام موصوف سے گہری عقیدت تھی۔ لہٰذا حکومت انہیں قتل کر کے بغاوت کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی اور سزا کو قید خانہ اور کوڑوں تک محدود رکھتی تھی۔ مشہور سرکاری اور معتزلی عالم احمد بن ابی داؤد کے امام موصوف سے مناظرے بھی کرائے جاتے اور جب ابن أبی داؤد امام صاحب کے دلائل سے لاجواب ہو جاتا تو

۱- آئینہ پرویزیت ص۶۰ بحوالہ تجدید مذہب ص۱۸۰۔

۲- آئینہ پرویزیت ص۵۶۔

۳- بحوالہ آئینہ پرویزیت ص۵۷۔

اگر امام صاحب اس مسئلہ میں تھوڑی سی بھی لچک پیدا کر لیتے تو لوگوں کی عام گمراہی کا بھی خطرہ تھا۔ لہٰذا کوڑے کھاتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے "القرآن کلام الله غیر مخلوق" گویا یہ مسئلہ اب امام صاحب کی زندگی اور موت کا مسئلہ نہ تھا بلکہ تمام امت کی ہدایت وضلالت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ اگر اس موقع پر امام صاحب ہار تسلیم کر لیتے تو اس کا دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلتا تھا کہ حکومت وقت عقائد اور دینی امور میں تغیر وتبدل کا حق رکھتی ہے اور یہ بات امام صاحب کو قطعاً گوارا نہ تھی۔ نہ ہی امت کا اجتماعی ضمیر اس کے لئے تیار تھا۔ چنانچہ صراحتاً نہیں تو باتوں باتوں میں لوگ خلیفہ تک اپنے خیالات کا اظہار کر بھی دیتے تھے (۱)۔

مامون کے بعد اس کا بھائی معتصم باللہ (۲۱۸-۲۲۷ھ) تخت نشین ہوا۔ یہ شخص گو علم وادب سے بیگانہ تھا مگر معتزلی عقائد میں اپنے پیش رو سے بھی زیادہ سخت تھا۔ اس کے دور کا افسوس ناک واقعہ یہ ہے کہ امام کو کوڑوں سے پیٹا جاتا۔ بعض دفعہ امام صاحب بے ہوش بھی ہو جاتے۔

معتصم کے بعد اس کا بیٹا واثق باللہ (۲۲۷-۲۳۲ھ) تخت وتاج کا وارث بنا۔ یہ معتزلہ عقائد کی اشاعت میں اپنے باپ سے بھی بڑھ گیا۔ واثق باللہ کے بعد اس کا بھائی متوکل باللہ (۲۳۲-۲۴۶ھ) تخت نشین ہوا تو اس نے امام موصوف کو باعزت طور پر رہا کر دیا۔ یہ معتزلہ عقائد سے بیزار اور متبع سنت خلیفہ تھا۔ اس طرح اعتزال سے جب حکومت کی پشت پناہی ختم ہوئی جو اس کا آخری سہارا تھا تو یہ فتنہ اپنی موت آپ مر گیا۔

ایک انگریز مصنف ان کے متعلق لکھتا ہے:

> ''معتزلہ کی عقلیت کا اسلام کے نظام فکر میں جذب ہونا دشوار تھا۔ اگر اعتزال کی تحریک کامیاب ہو جاتی تو اسلامی ثقافت انتشار اور برہمی کا شکار ہو جاتی اور اسلام کو اس سے ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔ ان کی علمی کاوشوں نے راسخ العقیدہ مسلمانوں کو بھی کسی حد تک اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔ لیکن جب معتزلہ کی انتہاء پسند جماعتوں نے اسلامی عقائد کو یونانی تصورات کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا اور قرآن کی بجائے اپنے دینی عقائد یونانی فلسفہ سے اخذ کرنا شروع کئے تو آخر الذکر طبقہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا (۲)۔

اعتزال کا فتنہ محض دولت عباسیہ کی پشت پناہی کے سہارے تقریباً سوا سو سال تک زندہ رہا۔ ورنہ امت کا اجتماعی ضمیر دین کے سادہ اصولوں کے مقابلہ میں ایسے فلسفیانہ عقائد کو گوارا کرنے کے لئے کسی وقت بھی تیار نہ ہوا۔ تاہم اس فرقہ کے زوال کی درج ذیل وجوہات ہیں:

۱- محدثین کرام کا زبردست تحقیقی کام جس نے مسلمانوں کے سوچنے والے لوگوں کو مطمئن کر دیا کہ رسول اللہ صلی

۱- بحوالہ آئینہ پرویزیت ص ۵۸۔

۲- آئینہ پرویزیت ص ۶۶ ماخوذ از ایچ-اے-ار گب۔

... بزرگان سے امت کو پہنچی ہیں اور ان کو مشتبہ روایات سے الگ کرنے کے علمی ذرائع موجود ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اعتزال وخوارج کے فتنوں، وضعی روایات کی کثرت اور انکار حدیث کے عام میلان نے ہی علماء دین کو احادیث کی تحقیق اور چھان پھٹک، راویوں پر جرح وتعدیل کے فن کو وجود میں لانے کی ضرورت کا شدید احساس دلایا۔

فن رجال کے امام اور معتبر مورخین نے اسی تیسری صدی ہجری میں اپنے اپنے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جن کی بناء پر امت نے وضعی روایات اور غیر اسلامی نظریات کو علی وجہ البصیرت رد کر دیا۔

علماء دین نے قرآن کی ہی تصریحات سے یہ ثابت کر دیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض ایک ''نامہ بر'' کی نہیں تھی جیسا کہ یہ لوگ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے معلم، رہنما، مفسر قرآن، شارع قانون، قاضی اور حاکم بھی مقرر کیا تھا۔ لہٰذا جو شخص آپ کی پیروی سے آزاد ہو کر قرآن کی پیروی کا دعویٰ کرتا ہے وہ فی الحقیقت قرآن کا پیروکار نہیں ہوسکتا۔ ان لوگوں کی قرآنی تاویلات بھی کھل کر لوگوں کے سامنے آچکی تھیں جو ایک دوسرے سے یکسر مختلف اور متضاد تھیں۔ لوگوں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر قرآن سے سنت کا تعلق ختم کر دیا جائے تو دین کا حلیہ کس بری طرح بگڑ جاتا ہے(۱)۔

امت کا اجتماعی ضمیر یہ تصور بھی اپنے ذہن میں نہ لاسکتا تھا کہ مسلمان رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے آزاد بھی ہوسکتا ہے۔ جو آج تک امت مسلمہ میں متورث چلی آرہی تھی۔ چند سر پھرے انسان تو ہر زمانہ اور ہر قوم میں ایسے نکل سکتے ہیں جو ایسی باتوں میں ہمنوا بن جائیں لیکن پوری امت کا سر پھرا ہو جانا مشکل ہے۔ چنانچہ امت مسلمہ اس بات پر قطعاً آمادہ نہ ہوسکی کہ زندگی کا ایک نیا نظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں سے بنوایا جائے جو دنیا کے مادی فلسفہ اور تخیل سے مرعوب ہو کر اسلام کا ایک جدید ایڈیشن پیش کرنا چاہتے تھے۔

بیرونی فلسفوں اور غیر اسلامی نظریات کا دوسرا دور انیسویں صدی عیسوی میں شروع ہوا لیکن دوسری صدی ہجری کی بہ نسبت اب حالات مختلف تھے۔ اس وقت مسلمان فاتح تھے اور انہیں سیاسی غلبہ حاصل تھا اور جن فلسفیوں سے انہیں سابقہ پیش آیا وہ مغلوب قوموں کا فلسفہ تھا۔

اس وجہ سے ان فلسفیوں کا حملہ بہت ہلکا ثابت ہوا۔ اس کے برعکس انیسویں صدی عیسوی میں یہ حملہ اس وقت ہوا جب مسلمانوں کے ملک پر دشمنوں کا قبضہ تھا۔ معاشی حیثیت سے وہ کچل دیئے گئے تھے۔ نظام تعلیم درہم برہم ہو چکا تھا۔ فاتح قوم نے اپنی تعلیم، تہذیب، زبان، سیاسی اور معاشی اداروں کو پوری طرح مسلط کر رکھا تھا۔ مسلمان ہر طرح سے ان سے مرعوب تھے۔ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ مغرب سے جو افکار ونظریات درآمد ہو رہے ہیں وہ سراسر معقول ہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے ان پر تنقید کر کے حق وباطل کا فیصلہ کرنا محض تاریک خیالی ہے۔ اور زمانے کے ساتھ چلنے کے لئے اسلام کو کسی نہ کسی طرح ان کے مطابق ڈھال لیا جائے(۲)۔

۱- آئینہ پرویزیت۔ص ۶۷۔

۲- ایضاً ص ۶۹۔

استفادہ کرتے ہیں۔سنت کے حجت ہونے سے انکار کر دیا قرآن کی من مانی تاویلات کے لئے راستہ صاف کر لیا۔اس دور کے سرخیل سرسید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸)ہیں آپ نے مغرب ہی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔مغربی افکار و نظریات سے شدید متاثر تھے اور مسلمان کی بھلائی اسی بات میں سمجھتے تھے کہ وہ مغربی علوم سے آراستہ ہوں۔اس غرض کے لئے آپ نے چند اقدامات کئے۔ایک تو ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد ڈالی، دوسرے قرآن کی تفسیر لکھ کر اپنے نظریات کو کھل کر قوم کے سامنے پیش کیا۔

یہ وہ دور تھا جب یورپ صرف اس بات کو ماننے پر تیار تھا جو عقل و تجربہ کی کسوٹی پر پرکھی جا سکتی ہو۔یہ دور خالص مادیت پرستی کا دور تھا۔ہر کام کے زیبا و نازیبا ہونے کا معیار دنیوی نفع و نقصان بن گیا تھا۔علاوہ ازیں اسی تہذیب نو نے مساوات مرد و زن کا نعرہ لگا کر کئی قسم کے عائلی مسائل کھڑے کر دیئے تھے جو اسلامی تعلیمات سے براہِ راست ٹکراتے تھے۔

سرسید ان تمام افکار و نظریات سے شدید متاثر تھے۔سرسید مرحوم کے بعد کچھ ایسے افراد بھی منظر عام پر آئے ہیں جنہوں نے مندرجہ بالا نظریات کی آبیاری کی۔مولوی چراغ علی مکمل طور پر سرسید کے ہمنوا تھے۔پھر کچھ ایسے حضرات بھی منظر عام پر آئے جن کے سامنے کوئی نیا نظریہ یا ذاتی فکر موجود نہ تھی۔انہوں نے اپنا سارا زور احادیث کو ظنی و نا قابل اعتماد اور نا قابل صحت قرار دینے پر صرف کر دیا۔ان میں سے چند قابل ذکر ہستیوں کے نام یہ ہیں:

عبداللہ چکڑالوی، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، علامہ مشرقی، حشمت علی لاہور، مستری محمد رمضان گوجرانوالہ، محبوب شاہ گوجرانوالہ، خدا بخش، خواجہ احمد دین امرتسری، سید عمر شا گجراتی۔

ان لوگوں نے احادیث کا کلیتاً انکار کر دیا اور "حسبنا کتاب اللہ" کہہ کر اس پر انحصار کیا۔لیکن اب مشکل یہ پیش آئی کہ قرآن کریم ارکان اسلام کی جزئیات تک بیان کرنے میں ساکت تھا۔اب احادیث کی بجائے انہیں محض غور و فکر کا سہارا لینا پڑا۔لیکن پھر بھی بات بنائے نہ بن سکی۔آخر ان سب دوستوں میں شدید اختلافات رونما ہوئے۔ان کے کئی فرقے بن گئے جو صرف ایک نماز ہی کے معاملے میں کئی طرح کے اختلافات رکھتے تھے اور وہ اختلافات بھی اصولی قسم کے تھے۔بعض فرقے صرف دو نمازیں پڑھتے تھے اور کچھ کا کہنا تھا کہ قرآن سے تین نمازوں کا ثبوت ملتا ہے۔کچھ ہر رکعت میں دو سجدے کرتے تھے اور کچھ ایک ہی سجدے کو کافی سمجھتے تھے۔نماز میں یہ لوگ صرف قرآنی آیات ہی پڑھتے تھے خواہ قیام ہو یا رکوع یا سجدہ۔کچھ ایسے بھی تھے جو سلام پھیرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔یہ اتنے اختلافات تو صرف نماز ہی کے متعلق تھے (۱)۔

۱- ملاحظہ ہو آئینہ پرویزیت از مولانا عبدالرحمن گیلانی ص ۶۹، ۷۰، ۱۱۸۔

ن چہارم

برصغیر کے چند مشہور منکرین حدیث کا مختصر تعارف

عبداللہ چکڑالوی

آپ ضلع گورداسپور کے موضع چکڑالہ میں پیدا ہوئے۔اسی نسبت سے یہ چکڑالوی کہلاتے ہیں۔آپ ایک الگ فرقہ مسمی ''اہل القرآن'' کے بانی ہیں۔آپ کا تبلیغی مرکز لاہور تھا۔آپ پہلے اہلحدیث اور متبع سنت تھے بعد میں حجیت حدیث سے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ اسے شرک فی الکتاب قرار دینے لگے۔وہ کہتے ہیں:

> ''پس کتاب اللہ کے ساتھ شرک کرنے سے یہ مراد ہے کہ جس طرح کتاب اللہ کے احکام کو مانا جاتا ہے اس طرح کسی اور کتاب یا شخص کے قول یا فعل کو دین اسلام میں مانا جائے خواہ فراضاً جملہ رسل وانبیاء کا قول یا فعل ہی کیوں نہ ہو جس طرح شرک موجب عذاب ہے اسی طرح مطابق (ان الحکم الا اللہ) الا لہ الخلق والامر) اور لاشرك في الحكمه احدیعنی دین میں اللہ کے حکم کے سوا اور کسی کا حکم ماننا بھی اعمال کا باطل کرنے والا باعث ابدی دائمی عذاب ہے۔افسوس شرک فی الحکم میں آج کل اکثر لوگ بتلا ہیں'' (۱)۔

انکار حدیث کی بناء پر آپ دوسرے منکرین حدیث کی طرح معجزات، شفاعت، عذاب قبر، ایصال ثواب اور تعدد ازدواج وغیرہ کے بھی قائل نہ تھے۔تعدد ازدواج کے سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں:

> ''تعدد ازدواج بحوالہ قرآن زنا میں داخل ہے جس سے انبیاء ورسل اور ان کی امت پاک ہے اور ان پر سراسر افتراء اور بہتان ہے'' (۲)۔

البتہ ایک بات ایسی ہے جس میں چکڑالوی صاحب دوسرے منکرین حدیث سے ممتاز نظر آتے ہیں اور وہ یہ کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سید الانبیاء ہونے کے بھی قائل نہ تھے۔آپ ایک سائل کو جواب یا فتویٰ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آپ نے اپنے مسلمہ قرآن، بخاری اور صحاح ستہ کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبیوں کا سردار لکھا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں متبع اور مقتدی کل انبیاء کا عموماً اور ابراہیم کا خصوصاً لقب مرحمت فرمایا ہے۔''......اور پھر آپ نے ان کو نبیوں کا سردار بنا کر دوسرے انبیاء ورسل کی تحقیر و تذلیل کر کے (لا نفرق بين احد من رسله) کا کفر کیا یا نہیں؟'' (۳)

۱- ترجمۃ القرآن ص ۹۸۔

۲- اشاعۃ القرآن مئی ۱۹۲۲ء ص ۱۸۔

۳- آئینہ پرویزیت ص ۱۲۰-۱۱۸ بحوالہ رسالہ ایضاً ص ۱۲،۱۴۔

تھے۔ دہلی میں علم حدیث کی تکمیل کی اور فارغ ہو جانے کے بعد لاہور میں قیام پذیر ہوئے۔ اس زمانے میں لاہور اعتقادی کشمکش کا مرکز بنا ہوا تھا۔ انگریز کے پھیلائے ہوئے فکری اور نظریاتی فرقے آزادی سے اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ عبداللہ چکڑالوی نے بھی اس شہر کی فضاء کو اپنے مشن کے موافق پا کر عوام الناس کو معمولی کوتاہیوں پر کافر قرار دینا شروع کر دیا جس سے ان کے خلاف مخالفت کی زبانیں وا ہونے لگیں۔ لاہور میں مسجد چینیاں میں جب مولوی رحیم بخش نے وفات پائی تو ان کے بعد اس کی امامت انہیں مل گئی۔ کچھ عرصہ حدیث کا درس دیتے رہے لیکن تھوڑے عرصہ بعد ہی اپنے درس میں صحیح بخاری کے لئے اصح الکتاب بعد کتاب اللہ الباری کی دلیل دے کر بخاری شریف کے علاوہ حدیث کی دوسری تمام کتابوں کو مشکوک قرار دے دیا۔ ایک عرصہ تک بخاری شریف کا درس جاری رہا۔ مگر طبعی اضطراب نے بخاری اور قرآن کا توازن شروع کر دیا۔ بعض احادیث خلاف آیات اللہ قرار دے کر اعلان کر دیا کہ جب قرآن ایک مکمل ہدایت ہے تو حدیث کی کیا ضرورت ہے۔ چینیاں والی مسجد کے مقتدی کچھ عرصے تک تو برداشت کرتے رہے پھر ایک روز مسجد سے نکال دیا۔ اسی عرصے میں ایک تفسیر بھی لکھی۔ جب مسجد سے نکال دیا گیا تو ان کا ایک مقتدی محمد بخش ساتھ چھوڑ گیا۔ چنانچہ انہوں نے ملتان میں ایک نواب صاحب کے ہاں رہنا شروع کر دیا۔ ایک موقع پر لوگوں نے کسی خاص واقعہ پر عبداللہ چکڑالوی کو سنگسار کر دیا اور وہ نیم مردہ اپنے آبائی وطن چکڑالے چلے گئے جہاں ایک طویل عرصے کے بعد انتقال کیا۔

''اہل قرآن نے مختلف عنوانات سے صوبے بھر میں اپنے مراکز قائم کئے۔ گوجرانوالہ میں اچھی خاصی تعداد میں اہل قرآن بن گئی۔ گجرات میں ''دتے شاہی'' فرقہ صرف تین نمازیں ادا کرتا اور دو نمازوں کو حدیثی نمازیں کہہ کر چھوڑ دیتا۔ امرتسر میں بھی ایک جماعت جماعت اہل قرآن کے مسلک اور عقائد کی اشاعت کرتی رہی ان کی وفات کے بعد غلام احمد پرویز اس مکتبہ فکر کے ترجمان بنے'' (۱)۔

طلوع اسلام ٹرسٹ والے عبداللہ چکڑالوی کے فرقہ کے بارے میں کچھ اس طرح تبصرہ کرتے ہیں:

فرقہ اہل قرآن: گمراہ ترین فرقہ

ہماری تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ خدا کی کتاب پر ایمان رکھنے والی قوم (مسلمانوں) میں جب اور جہاں بھی خدا کی کتاب کی آواز بلند کرنے کی کوشش کی گئی، اس قوم کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی اور اس کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ زمانے کے تقاضوں کی بناء پر ہمارا دور قرآنی پیغام کی طرف متوجہ ہونے کے لئے سابقہ ادوار کے مقابلہ میں زیادہ آمادہ تھا۔ انہی حالات کے پیش نظر طلوعِ اسلام نے یہ منصب اختیار کیا کہ قرآن کی آواز کو بے غل وغش قوم (اور دنیا) کے سامنے پیش کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ مفاد پرست گروہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہونی تھی اور اس مخالفت میں مذہبی پیشوائیت نے ہراول دستے کا کام دینا تھا۔ چنانچہ یہ مخالفت ہوئی اور اب تک ہو رہی ہے۔ اگرچہ اس کا زور دن

۱- اسلامی انسائیکلو پیڈیا ص ۶۷، ۶۸ از قاسم محمود۔ تاریخ اشاعت ۲۰۰۰ء۔

اور جو (بدقسمتی سے) اپنے آپ کو قرآن کی طرف منسوب کرتا ہے۔ یعنی فرقہ اہل قرآن۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ اس فرقہ کے بانی (مولوی عبداللہ چکڑالوی) مرحوم کی نیت یہ ہی تھی لیکن عموماً ہوا یہ کہ قرآن کے راستے میں سب سے بڑی روک بن گیا۔ ہم نے اس فرقہ کا کبھی تفصیلی جائزہ نہیں لیا اس لئے کہ اسے چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ مولوی عبداللہ مرحوم کی وفات کے بعد ان کے معتقدین ادھر ادھر بکھر گئے اور ان کی حیثیت محض انفرادی رہ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ان میں ایسے اختلافات نمودار ہو گئے کہ ان کی توانائیاں ایک دوسرے کے ساتھ الجھ کر ضائع ہو گئیں۔ (کوئی ایک نماز کا قائل، کوئی تین کا، کوئی پانچ کا، کوئی تین روزوں کا، کوئی نو رکا، کوئی مہینہ بھر کا، کسی کے نزدیک انڈہ حلال، کسی کے نزدیک حرام) اب ان کے کچھ افراد سمٹ کر لاہور میں جمع ہو گئے ہیں جو ماہنامہ بلاغ القرآن کے ذریعے اپنی ہستی کا ثبوت پیش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی چند دنوں کا کھیل ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ جس نظریہ میں زندہ رہنے کی قوت نہیں ہوتی مرور زمانہ اسے از خود ختم کر دیتا ہے۔ ان حالات کے پیش نظر یہ فرقہ ایسی اہمیت کا حامل نہیں کہ اس کا خصوصیت کے ساتھ نوٹس لیا جائے لیکن بعض اوقات ان کی طرف سے ایسی شر رفشانیاں ہوتی ہیں جن کا ازالہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو کبھی کبھی اس فرقہ کا تذکرہ طلوع اسلام کے صفحات میں آ جاتا ہے۔

۲- یہ فرقہ فکری اور عملی ہر دو لحاظ سے ایسی بنیادوں پر استوار ہے جن میں مسلمانوں کے باقی فرقوں میں سے کوئی بھی ان سے اشتراک نہیں رکھتا۔ یعنی:

(۱) ان کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر احکامات آئے ہیں ان کی تمام جزئیات اور تفصیلات بھی قرآن مجید نے خود متعین کر دی ہیں۔ جہاں تک ہماری معلومات ہماری رہنمائی کرتی ہیں اس سے پہلے کسی فرقہ نے بھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا۔

(۲) ان کا سب سے بڑا ''کارنامہ'' یہ ہے کہ یہ تین وقتوں کی نماز کے قائل ہیں۔ ہماری تحقیق کی رو سے اس سے پہلے مسلمانوں کے کسی فرقے نے ایسا نہیں کیا۔

ہم اس مقام پر بلاغ القرآن والوں کے مسالک پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ اس عقیدہ کے ماننے والوں میں سے بعض افراد نماز کے علاوہ روزہ، زکوٰۃ، حرام حلال وغیرہ کے معاملات میں بھی ایسی نرالی باتیں کرتے ہیں جن کا اس سے پہلے کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔

فکری اور عملی لحاظ سے مندرجہ بالا دو امور کی بنا پر ہی ان میں اور مسلمانوں کے دوسرے فرقوں میں ایک ایسی خلیج حائل ہے جس کے پر ہونے کا امکان ہی نہیں۔

(۳) اس کے بعد دیکھئے کہ اس فرقہ نے خود قرآن مجید کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔ اس ضمن میں پہلے دو ایک مسلمات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

۱- قرآن کریم کی رو سے امت مسلمہ میں فرقہ بندی شرک اور خدا کے عذاب کا موجب ہے۔

۳- اس شق نمبر ۲ کا فطری اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اگر فکر و عمل کی بنیاد قرآن ہو تو امت میں اختلاف و تفریق (فرقہ بندی) پیدا نہیں ہو سکتی۔ (قرآن کے بنیاد بننے کی عملی شکل کیا ہے اس کے متعلق آگے بات کی جائے گی۔

۴- امت میں مختلف فرقے ہیں لیکن ان میں سے کسی کا دعویٰ یہ نہیں کہ ان کے فکر و عمل کی بنیاد قرآن خالص ہے۔ نظری طور پر قرآن کو سب مانتے ہیں لیکن عملاً ان میں سے بعض احادیث کو اپنے مسلک کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور بعض فقہ کو۔ لہٰذا ان کے باہمی اختلافات کے متعلق یہی کہا جائے گا (اور یہی کہا جاتا ہے) کہ ان کی وجہ روایات اور فقہ کا اختلاف ہے قرآن مجید پر اس سے کوئی حرف نہیں آتا۔

۵- لیکن فرقہ اہل قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کے عمل کی بنیاد قرآن خالص ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ ان کے عمل میں کسی قسم کے اختلافات نہ ہوں۔

لیکن ان کے عمل کی کیا کیفیت ہے اس کے لئے ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں اور وہ بھی نماز کے اوقات کے سلسلہ میں جو (ان کے دعویٰ کے مطابق) ان کا امتیازی کارنامہ ہے۔ اسے ذرا غور سے سنئے۔

(الف) اس فرقہ کے بانی مولوی عبداللہ چکڑالوی (مرحوم) قرآن مجید خالص سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ نماز پانچ وقتوں کی ہے۔ (۱)

(ب) اور اس فرقہ (یا عقیدہ) کے متبع بلاغ القرآن والے اس قرآن خالص سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ نماز تین وقتوں کی ہے۔ اب پوچھنے والے پوچھتے ہیں کہ جب قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ اس سے پانچ وقتوں کی نماز بھی ثابت ہو جاتی ہے اور تین وقتوں کی بھی تو اس دعویٰ کے متعلق کیا کہا جائے گا ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلاف کثیر (۴/۸۲) ''اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بہت سے اختلافات ہوتے۔'' (اور یہ تو صرف ایک مسئلہ اوقات صلوٰۃ کے متعلق ہے۔ اگر دیگر مسائل کو بھی دیکھا جائے تو نا معلوم ان میں کس قدر باہمی اختلافات ملیں جن میں ہر ایک سے متعلق یہ دعویٰ ہے کہ وہ قرآن سے ثابت ہے) یہ ہے ان حضرات کا مسلک جس نے قرآن مجید کو اس قدر نقصان پہنچایا کہ اس سے اس کا بنیادی دعویٰ ہی (معاذ اللہ) باطل ہو جاتا ہے۔

۶- قارئین شاید یہ معلوم کرنے کے بھی متمنی ہوں کہ یہ حضرات نماز غیرہ کی تفاصیل قرآن خالص سے کس طرح نکالتے ہیں۔ اس کے لئے ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔ سورہ قصص میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا تو انہیں جو ہدایات دیں ان میں ایک یہ بھی کہ وہاں کسی سے ڈرنا نہیں، کسی سے مضطرب و بے قرار نہیں ہونا۔ پوری دلجمعی اور اطمینان سے اپنی بات پیش کرنا۔ اس کے لئے کہا کہ واضمم الیک جناحک من الرھب (۲۸/۳۲) خوف کی حالت میں اپنے بازو سمیٹ لینا پرندہ خوف سے پھڑ پھڑاتا اور اڑتا ہے۔ حالت امن میں وہ اپنے بازو (پر) سمیٹ لیتا ہے۔ یہیں سے یہ محاورہ ہے۔

۱- ترجمۃ القرآن از مولوی عبداللہ چکڑالوی پارہ نمبر ۴ ص ۶۳ و دیگر مقامات۔

کے اوپر جمع کر کے سینے سے ملا لو یہ عاجزی کی علامت ہے۔ اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ اس سے ثابت یہ ہوگا کہ نماز میں ہاتھ سینے سے باندھنے چاہئیں۔ یہ ہے وہ طریق جس سے یہ لوگ قرآن مجید سے احکام قرآن کی تفاسیر اور جزئیات نکالتے ہیں۔ اب سوچئے اس سے انہوں نے قرآن مجید جیسی کتابِ عظیم کو کس طرح بازیچہ اطفال بنا دیا ہے۔ (۱)

نیاز فتح پوری

۱۸۷۷-۱۹۲۲ء فتح پور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے بعد مختلف رسائل میں بطور ایڈیٹر کام کیا۔ پھر لکھنؤ سے اپنا رسالہ نگار نکالا۔ آپ نے ٹیگور کی کتاب گیتا نجلی کا اردو ترجمہ کیا۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ پر فلسفہ کا رنگ بہت زیادہ غالب تھا۔ جس کی وجہ سے آپ منکر حدیث ہی نہیں بلکہ منکر قرآن اور منکر اسلام بھی ہو گئے تھے۔ آپ کی کتاب ''من ویزدان'' آپ کے عقائد ونظریات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ تمام منکرین حدیث میں آپ کی امتیازی شان یہ ہے کہ آپ قرآن کو نہ خدا کا کلام سمجھتے ہیں اور نہ ''منزل من اللہ'' بلکہ اسے ایک انسان کا کلام سمجھتے ہیں۔ اب ''من ویزدان'' کے درج ذیل اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ عام مسلمانوں اور مولویوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن اپنے الفاظ اور اپنی ترتیب کے لحاظ سے مکمل طور پر پہلے لوح محفوظ میں منقوش وموجود تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہی آسمانی الفاظ کو دہراتے تھے۔ حد درجہ مضحکہ خیز ہے اگر قرآن کی زبان عربی نہ ہوتی بلکہ کوئی نئی زبان ہوتی تو بھی خیر کچھ کہا جاسکتا تھا۔ بہر حال قرآن کو خدا کا کلام اس حیثیت سے تسلیم کرنا کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کا بتایا ہوا ہے اور خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عقل ودماغ کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ خدا کو اس کے منصب سے گرا کر انسان کی حد تک کھینچ لانا ہے اور رسول کو سطح انسانیت کی حد تک کھینچ لانا ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سطح انسانیت سے بھی نیچے گرا دینا ہے۔ (۲) اب سوال یہ ہے کہ اگر قرآن عربی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں ایک عربی رسول اور عربی امت پر نازل ہوتا تو ایسے قرآن کا فائدہ کیا تھا جسے نہ نبی سمجھتا نہ کوئی دوسرا اسے سمجھ سکتا اور یہ کتاب کتاب ہدایت کیسے قرار دی جاسکتی ہے۔ لیکن یہی وجہ نیاز صاحب کے نزدیک خدا کو انسان کے مقام پر اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو انسان سے بھی کسی کم تر مقام پر لانے کے مترادف ہے۔ چنانچہ وہ کھل کر اپنے فکر کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

> ''کلامِ مجید کو نہ میں کلام خداوندی سمجھتا ہوں اور نہ الہام ربانی بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں اور اس مسئلہ پر میں اس سے قبل کئی بار مفصل گفتگو کر چکا ہوں'' (۳)۔

گویا قرآن کو انسان کا کلام سمجھنا ہی دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانیت کے مقام پر اور خدا کو خدائی کے مقام پر سمجھنے کے مترادف ہے۔ یہ تو تھی آپ کے ایمان اللہ ایمان بالرسول اور ایمان بالکتاب کی مثال۔ اب باقی اسلامی

۱- قرآنی فیصلے ج دوم دوسرا ایڈیشن ص۲۳۱ تا ۲۳۴۔

۲- من ویزداں حصہ اول ص۵۵۲۔

۳- حوالہ ایضا ص۴۵۔

''ہر چند خدا کے اس جدید تصور سے انبیاء و رسل، مصحف مقدسہ، حیات بعد الموت، دوزخ و جنت، ملائکہ و شیاطین، حشر و نشر، عذاب و ثواب ختم ہو جائیں گے یا ان کی کوئی توجیہ کرنا ہو گی لیکن اس کا کوئی علاج نہیں ہم کو ان مروجہ عقائد اور خدا دونوں میں سے ایک کو لینا ہے اور غالباً یہ زیادہ آسان ہو گا کہ خدا کے مقابلہ میں معتقدات کو پس پشت ڈال دیا جائے گا۔''(۱)

یہ تو تھا اسلامی عقائد سے آپ کی بیزاری کا اعلان۔ اب خدا کے متعلق آپ کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے:

''خدا کو آگ برساتے ہوئے، خون اور پیپ پلاتے ہوئے، آتشیں کوڑوں سے سزا دیتے ہوئے بہت زمانہ ہو چکا ہے۔ اب ضروری ہے کہ وہ صرف زخموں پر مرہم رکھے اور بجائے کسی خاص قوم پر لطف کرنے کے وہ تمام بنی نوع انسان کو اپنا ہی بندہ سمجھے اور نجات کا دروازہ سب کے لئے بغیر کسی شرط کے کھول دے لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک مذاہب کا عقائدی اختلاف دور نہ ہو خدا کا کوئی ایسا کائناتی تصور قائم ہی نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی شخص اختلاف عقائد کو مہمل قرار دیتا ہے تو اسے ملحد و کافر قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس لئے میری رائے میں خدا کی خدائی اگر صحیح معنی میں قائم ہو سکتی ہے تو اس سے توقع ہم کو صرف کافروں اور ملحدوں ہی سے کرنا چاہیئے''(۲)۔

سو یہ نیاز فتح پوری صاحب جو خدا کو بھی ہدایت جاری فرما سکتے ہیں علمائے وقت نے جب آپ کی یہ اسلام بیزاری اور کافروں اور ملحدوں میں شامل ہونے کی آرزو دیکھی تو آپ پر کفر و الحاد کا فتویٰ لگایا اور آپ کو موقع دے دیا کہ آپ اختراعی خدا کی خدائی قائم کرنے میں ممد ثابت ہوں۔(۳) جب آپ پر کفر و الحاد کا فتویٰ لگا دیا گیا تو آپ نے فرمایا:

''یہ تھا وہ سب سے پہلا فتویٰ کفر و الحاد جس نے مجھے یہ کہنے پر مجبور کیا کہ اگر مولویوں کی جماعت واقعی مسلمان ہے تو میں یقیناً کافر ہوں اور میں مسلمان ہوں تو یہ سب نا مسلمان ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اسلام نام ہے صرف کورانہ تقلید کا اور تقلید بھی اصول و احکام کی نہیں بلکہ بخاری و مسلم و مالک وغیرہ کی اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ حقیقی کیفیت اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہو سکتی جب تک ہر شخص اپنی جگہ غور کر کے کسی نتیجہ پر نہ پہنچے''(۴)۔

نیاز صاحب کے درج بالا بیان سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

انکار حدیث کے ساتھ ہی انکار قرآن کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر پورے طور پر انکار قرآن اور اس کے بعد انسان گمراہی کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے۔

۱- من و یزدان حصہ اول ص ۴۹۴۔
۲- حوالہ ایضاً ص ۵۳۸۔
۳- آئینہ پرویزیت ص ۱۲۲۔
۴- من و یزدان حصہ اول ص ۵۴۷۔

ہے۔اسلام کے نام میں کچھ ایسی کشش ہے کہ ملحد اور دہریہ ہونے کے باوجود کوئی مسلمان دائرہ اسلام سے خارج ہونا پسند نہیں کرتا۔اس کے تمام عقائد ونظریات کو پامال کرنے کے بعد بھی اسلام سے وابستہ رہنا پسند کرتا ہے۔(۱)

علامہ عنایت اللہ مشرقی

۱۸۸۸-۱۹۶۴ء آپ تعلیم سے فراغت کے بعد اسلامیہ کالج پشاور کے پرنسپل بنے۔انشاء پرداز فلسفی اور مؤرخ تھے۔تذکرہ ''قول فیصل'' مولوی کا غلط مذہب اور ارشادات آپ کی تصانیف ہیں۔آپ نے ۱۹۳۱ء میں ''خاکسار تحریک'' کی بنیاد ڈالی اور ایک ہفتہ وار پرچہ ''الاصلاح'' جاری کیا۔۱۹۴۰ء میں یہ تحریک خلاف قانون قرار دی گئی اور دم توڑ گئی۔آپ اچھرہ میں مدفون ہوئے۔آپ نیاز فتح پوری کے ہم پلہ فلسفی تو نہ تھے تاہم ان سے آدھے ضرور تھے۔(۲) حدیث اور فقہ سے انکار کے بعد عقل نے آپ کو جس مقام پر پہنچایا اس کا نقشہ کچھ اس طرح پیش فرماتے ہیں:

''تعجب ہے کہ مذہب کی طرف اس عام میلان کے باوجود ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ قطعی فیصلہ نہ ہوسکا کہ کون سا مذہب سچا ہے؟ کون سا شارع کائنات اللہ تعالیٰ کے منشاء کے عین مطابق ہے؟ مذہب کی سچائی کا معیار کیا ہے؟ نہیں بلکہ خود مذہب کیا شے ہے؟ اور اس کا مقصود بالذات بعینہٖ کیا ہے؟ خود خدا کی ہستی اور اس کے صحیح منشاء کے متعلق آج تک کوئی حتمی اور متفق علیہ دلیل نہیں مل سکی۔''(۳)

اب دیکھئے علامہ خدا کی ہستی کے متعلق کوئی ایسی حتمی اور متفق علیہ دلیل چاہتے ہیں جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ ہم عرض کریں گے کہ ایسی حتمی اور قطعی دلیل موجود ہوتی تو کسی بھی شخص کا کافر یا دہریہ ہونا ناممکن ہوتا۔پھر خدا کی اطاعت اضطراری ہوتی اختیاری نہ ہوتی۔جیسے کہ دوسری تمام اشیائے کائنات (سوائے جن وانس) اللہ کی عبادت میں مصروف ہیں۔لیکن انسان کو اختیار اور عقل بھی عطا کی گئی ہے اور یہ بات انسان کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ خدا کو تسلیم کرے یا نہ کرے۔بذریعہ وحی اس کی عقل کی رہنمائی اس انداز میں ضرور کی گئی ہے کہ وہ اشیائے کائنات میں غور وتدبر کے بعد خدا کی ذات پر یقین کرے اور اگر انسان اتنا عقلمند نہیں تو انہیں کسی بھی رسول یا مذہب یا کسی مذہب کی سچائی ڈھونڈنے کی کیا ضرورت؟ آپ کی فلسفیانہ فکر نے آپ کو صرف حدیث سے ہی نہیں بلکہ مذہب اور خدا سے بے نیاز کردیا۔لیکن اسلام سے وابستگی آڑے آتی رہی اور قرآن سامنے رہا۔قرآن میں آپ کو مغربی اقوام ہی صحیح مومن نظر آنے لگیں۔انگریز قوم اور انگریزی تہذیب کی جو عقیدت آپ کے دل میں تھی اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔

''یہی انگریز تو وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں فرشتوں نے اپنے پروردگار سے جب زمین

۱- آئینہ پرویزیت از مولانا عبدالرحمٰن گیلانی ص۱۲۳۔

۲- آئینہ پرویزیت ص۱۲۳۔

۳- دیباچہ تذکرہ قول فیصل ص۲۔

اور خونریزی کرے گا، اور ہماری تو یہ حالت ہے کہ ہم تیری حمد وثناء کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔'' تو اللہ تعالیٰ نے ان کے آئندہ اعمال پر غور کرتے ہوئے فرشتوں کو جواب دیا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔'' پھر اللہ تعالیٰ نے ان انگریزوں کو بہت سی چیزوں کے نام اور بہت سی چیزوں کی حقیقتوں سے آگاہ کر یا اور پھر ان چیزوں کے استعمال پر قدرت دی۔'' (۱)

تاہم آپ نے بعد میں یہ اقرار کرلیا تھا کہ میں پیٹ کی خاطر قرآن کی تکذیب کرتا رہا ہوں۔ وہ تذکرہ میں لکھتے ہیں:

''میں اپنے نفس کے لئے شب و روز ظلم کرتا رہا ہوں اور صبح و شام اپنی تنخواہ کے لئے انگریز کی پرستش کرتا رہا ہوں اور اپنے رب کی عبادت نہیں کرتا تا کہ وہ مجھے اپنی طرف سے روزی عطا فرمائے۔ میں دن بدن قرآن کی تکذیب کرتا رہتا ہوں اور میں توحید پر مداومت کی طاقت نہیں رکھتا بلکہ اپنے نفس کے لئے مکر پر مکر کیے جاتا ہوں اور بڑی سرعت سے بار شرک میں مبتلا ہو رہا ہوں۔ سو تم مجھے نہ دیکھو بلکہ جو کچھ میں کہتا ہوں اسے دیکھو'' (۲)۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

بسال ضلع کیمبل پور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے بعد محکمہ تعلیم پنجاب سے منسلک رہے اور کیمبل پور کے کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ آپ کی تصانیف ایک اسلام دو اسلام دو قرآن، حرف محرمانہ اور تاریخ حدیث ہیں۔ آپ بھی علامہ مشرقی کی طرح اقوام مغرب اور مغربی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ حدیث کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں: ''ملا سے میرا نزاع اس بات پر ہے کہ وہ حدیث کو آگے لا کر بے شمار ظواہر کو جزو اسلام ماننا چاہتا ہے اور میں قرآن کو پیش کر کے ملت کو ان ملائی قیود سے آزاد کرانا چاہتا ہوں۔'' (۳)

انکار حدیث کے بعد فکر قرآنی نے آپ کو جس مقام پر پہنچایا اس کا ماحصل یہ ہے:

۱- رسولوں پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے امنوا باللہ والیوم الاخر کو قبول اعمال کی بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ اس میں ایمان بالرسل شامل نہیں۔'' (۴)

۲- حتیٰ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لانا ضروری نہیں۔ لکھتے ہیں ''ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ اللہ تعالیٰ

۱- تذکرہ عربی ایڈیشن ص ۴۷۔

۲- حوالہ ایضاً ص ۱۴۱۔

۳- آئینہ پرویزیت ص ۱۲۴۔

۴- ایک اسلام ص ۴۹۔

تھے مگر ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے قائل نہ تھے۔ ممکن ہے ملا میری اس تحریر سے بھڑک اٹھے کے لو جی یہ زندیق وملحد نجات کے لئے ایمان بر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ضروری نہیں سمجھتا۔'' (۱)

۳- اب اس فکر برق کا دوسرا پہلو یہ ہے:

''دوسری اقوام کے انبیاء سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم مرتبہ نہیں مثلاً موسیٰ وعیسیٰ، ابراہیم ومحمد، ابراہیم وکشن، کنفیوشس وزرتشت و بدھ علیہم السلام۔'' (۲)

۴- آپ نے پہلے تو ایمان بر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی غیر ضروری قرار دیا تھا۔ اب تمام انبیاء کو ضروری قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دوسری اقوام کے انبیاء پر ایمان لانا ان کے اسوۂ ہائے حسنہ پر چلنا ان کے مناقب بیان کرنا، انہیں ہر لحاظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم مرتبہ ثابت کرنا اوران کی تعلیمات کو تعلیمات قرآن کہنا ہمارا کام تھا لیکن اسے کر رہے ہیں بعض غیر مسلم۔'' (۳)

کچھ پتہ ہے یہ بعض غیر مسلم جو ہمارے کرنے کے کام کر رہے ہیں وہ کون ہیں؟ وہ ہیں اقوامِ مغرب، آپ بھی علامہ مشرقی کی طرح اقوام مغرب پر ان کی تہذیب پر بہ دل و جان نثار تھے۔ انگریز قوم کے فضائل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہاں آپ کی آنکھوں کے سامنے اللہ کے تمام انعامات سے (انگریز) لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ سلطنت اس کی، علم اس کا، فضائیں اس کی، ہوائیں اس کی۔ باغ اس کے، نہریں اس کی، دانش اس کی، حکمت اس کی۔ اگر کل کو اللہ اس کی آخرت بھی سنوار دے تو آپ اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔'' (۴)

۵- آپ اسی قوم انگریزی کو ہی متقین قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''متقین کا مصدر ہے تقویٰ جس کے معنیٰ ہیں حفاظت، بچاؤ، ڈیفنس یعنی متقی لوگ وہ ہیں جن کا ڈیفنس مضبوط ہو، جن کی سرحدیں مستحکم ہوں، جو مہیب عسکری طاقت کے مالک ہوں اور جن کا کردار اتنا بلند ہو کہ ان پر کسی قسم کا حملہ نہ کیا جا سکے۔''

برق صاحب نے بھی (پرویز صاحب کی طرح) چند در چند کتب لکھ کر یہ نظریہ پیش کیا کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی کی وجہ یہی حدیثی اسلام ہے اور جب تک مسلمان اس سے پیچھا نہیں چھڑائیں گے ان کی اصلاح ناممکن ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ بتدریج اس حدیثی اسلام کی طرف خود بھی مائل ہونے لگے۔ چنانچہ دو اسلام میں ایک باب ''صحیح حدیث کو ماننا پڑے

۱- ایک اسلام ص ۴۷۔

۲- ایضاً ص ۲۵۔

۳- ایضاً ص ۲۴۔

۴- ایضاً ص ۴۶۔

نہیں کیا بلکہ ''تاریخ حدیث'' لکھ کر تلافی مافات بھی کر دی۔ (۱)

اسلم صاحب جے راج پوری

۱۲۹۹ھ میں جیراج پور ضلع اعظم گڑھ (یو-پی بھارت) میں پیدا ہوئے۔تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں لیکچرار لگ گئے۔ بعد میں جامعہ دہلی میں تاریخ اسلام کے استاد مقرر ہوئے۔آپ کی قابل ذکر تصانیف تاریخ القرآن، تاریخ امت (۸ جلدوں میں) اور الوراثۃ فی الاسلام ہیں۔منکرین حدیث میں بعض وجوہ سے آپ کا مقام بلند ہے۔ پرویز صاحب نے ان ہی کے فکر قرآنی سے فیض حاصل کیا ہے۔آپ کی نظر میں حدیث کی اہمیت تاریخ سے کچھ زیادہ نہیں۔ بالفاظ دیگر کوئی شخص بھی موجودہ احادیث میں سے اگر کوئی حدیث قبول کرنا چاہے تو وہ محض اس کی پسند اور مرضی پر منحصر ہے اور اگر رد کر دیتا ہے تو بھی چنداں مضائقہ نہیں۔(۲) چنانچہ حافظ اسلم صاحب الیوم اکملت لکم دینکم کی تفسیر لکھتے ہوئے احادیث پر ان الفاظ میں تبصرہ فرماتے ہیں:

حافظ اسلم کا نظریہ حدیث

اس تکمیل کے بعد اب دین میں کمی کیا رہ گئی جو روایتوں سے پوری کی جائے؟ اس لئے روایتوں کی جگہ اپنی تاریخ کی الماری ہے، ان سے تاریخی اور علمی فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں اور فقہ اسلامی یعنی قوانین وضوابط کے استنباط میں کام کیا جا سکتا ہے۔حدیثوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، اعمال اور احوال بیان کئے گئے ہیں اور اسی کا نام تاریخ ہے۔ بے شک قرآن کے احکام مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عمل کر کے دکھایا اور امت کو سکھایا اور جو سلسلہ متواتر چلا آ رہا ہے وہ یقینی اور دینی ہے کیونکہ تواتر یقین کی اقسام میں داخل ہے اور اسی کے متعلق قرآن نے کہا ہے ولکم فی رسول اللہ اسوہ حسنۃ. (۳)

اس تبصرہ پر جناب غلام احمد پرویز صاحب فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں کہ ''تواتر بھی وہی یقینی ہے جو قرآن کے مطابق ہو'' انکار حدیث کے بعد علامہ مشرقی اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق تو انگریز قوم کے دلدادہ بن گئے تھے مگر آپ ان کے برعکس روس نوازی اختیار فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں ''اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں سوویت روس میں اہل مذاہب اور مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہیں لیکن جو لوگ قرآنی زاویہ نگاہ رکھتے ہیں وہ دیکھ رہے ہیں کہ عالم میں کچھ حرب وضرب، شورش وانقلاب، تغیر وتبدل ہو رہا ہے وہ سب تکمیل دین اور اتمام نور کے لئے ہو رہا ہے۔اسلام کے واسطے زمین تیار کی جارہی ہے۔ کیونکہ انسانیت کو ایک نہ ایک دن ان حقائق ثابتہ پر پہنچنا لازمی ہے۔'' (۴)

۱- آئینہ پرویزیت ص ۱۲۵۔
۲- آئینہ پرویزیت ص ۱۲۵۔
۳- طلوع اسلام ستمبر ۱۹۵۵ء۔
۴- نوادرات ص ۱۱۴۔

سفک دم اور عداوت پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں۔ان کا مٹانا اسلام کا فریضہ ہے اور یہی روسیوں نے کیا ہے۔ (۱)

اب سوال یہ ہے کہ یہ حقائق ثابتہ جو قرآن میں مذکور ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھے یا نہیں؟ اگر معلوم تھے تو کیا انہوں نے اسی طرح دوسرے مذاہب پر مظالم ڈھا کر اسلام کے لئے زمین ہموار کی جس طرح موجودہ دور میں روس میں ہو رہا ہے اور نفی لا کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہی مطلب سمجھا تھا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔

آپ کے روس نوازی کے قرآنی فکر کی بنیاد پر آگے پرویز صاحب نے ''قرآنی نظام ربوبیت'' ایجاد فرمایا اور تمام منکرین حدیث پر آپ کا احسان یہ ہے کہ آپ نے ''مرکز ملت کا تصور'' اختراع کر کے ان حضرات کو ایک بہت بڑی پریشانی سے نجات دلائی۔آپ کے مزید عقائد و نظریات کی تفصیل اس کتاب میں مل جائے گی۔ بالخصوص اس کتاب کا حصہ دوم حدیث میں آپ ہی کے ارشادات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ پھر آپ نے بعض ایسے مسائل کا بھی انکار کیا جن کے ارشادات قرآن کریم میں ملتے تھے مگر ان کی وضاحت احادیث میں مذکور تھی اور متفقہ طور پر مسلمانوں میں تسلیم کئے جاتے تھے۔ان میں کچھ مسائل ایسے بھی تھے جس کی داغ بیل سرسید احمد خاں ڈال چکے تھے مثلاً حج کے موقع پر کھانے پینے کی ضرورت سے زیادہ قربانی آپ کے خیال میں ایک لغو فعل تھا۔سید صاحب تعدد ازدواج کے بھی قائل نہ تھے۔وہ قرآن کریم میں کسی طرح کے نسخ کے بھی قائل نہ تھے۔وہ بینکوں کے سود اور تجارتی سود کو جائز قرار دیتے تھے۔(اس مسئلہ میں ادارہ طلوع اسلام سید صاحب سے اختلاف لکھتا ہے) نیز وہ وصیت کے لئے کسی شرط کے بھی قائل نہ تھے۔حافظ اسلم صاحب نے ان مسائل کو شرح و بسط سے پیش کیا اور کچھ مزید مسائل کا اضافہ بھی کیا۔مثلاً عذاب قبر سے انکار اور اطاعت والدین کی نفی وغیرہ وغیرہ۔(۲)

غلام احمد پرویز

غلام احمد پرویز حافظ اسلم جیراج پوری کے فیض یافتہ ہیں۔آپ نے عمر کا بیشتر حصہ سرکاری ملازمت میں گزارا۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ میں سیکشن آفیسر کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔آپ علامہ اقبال کے شیدائیوں میں سے تھے اور علامہ کے کلام کا بیشتر حصہ آپ کو ازبر تھا۔ ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال نے وفات پائی تو ان کی یادگار کے طور پر سید نذیر نیازی صاحب نے ایک ماہنامہ بنام طلوعِ اسلام جاری کیا۔تھوڑی مدت کے بعد غلام احمد پرویز اس ماہنامہ کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور پھر اس کی سرپرستی سنبھال لی۔شروع میں علامہ اقبال کی تعلیمات اور افکار کے حوالہ سے لکھتے رہے لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے اس پرچہ کو اپنے افکار و نظریات کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا تو آپ دہلی سے کراچی منتقل ہوئے۔ کراچی آ کر آپ نے اس ماہنامہ کو اب محض اپنے افکار کی اشاعت کے لئے مختص کر لیا۔اس ماہنامہ کا جلد نمبر بھی ۱۹۴۷ء سے

۱- نوادرات ص ۱۱۵۔

۲- آئینہ پرویزیت ص ۱۲۷۔

۱۹۵۵ء میں غلام احمد پرویز نے ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔ اس کے بعد لاہور منتقل ہوگئے اور گلبرگ میں رہنے لگے۔ فروری ۱۹۸۵ء میں ۸۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ غلام احمد پرویز مغربی مفکرین کے افکار و نظریات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور اپنے مافی الضمیر کی تشریح کے لئے بکثرت ان کے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ بعد میں قرآنی آیات لکھ کر ان افکار پر فٹ کر دیتے ہیں۔(۱) آپ نے اپنے افکار و نظریات کی مکمل وضاحت کے لئے طلوع اسلام کو ادارہ کی شکل دی جس کے مدیر آپ خود رہے۔ اس ادارہ نے آپ کی بہت سی تصانیف کو بھی شائع کیا اور آپ کے افکار و نظریات کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ غلام احمد پرویز نے اپنے افکار و نظریات کو پھیلانے کے لئے وسیع لٹریچر تخلیق کیا۔ ذیل میں آپ کے افکار کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

امت مسلمہ سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرض اور واجب و لازم ہے۔ لیکن غلام احمد پرویز اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''مقلد آئمہ ہوں مقلد روایات، تقلید کی تائید میں ان کی دلیل یہ ہے کہ ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کبار یا ائمہ فقہ کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ یہ کہتے وقت اتنا نہیں سوچتے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کبار یا ائمہ فقہ کسی کے مقلد نہیں تھے۔ وہ مسائل زندگی کا حل خود سوچتے تھے۔ آپ بھی اپنے مسائل زندگی کا حل خود تلاش کیجئے۔'' (۲)

اس اقتباس میں غلام احمد پرویز صاحب نے تقلید کا لفظ ائمہ اجتہاد و فقہا کے ساتھ صحابہ و کبار اور اس سے بڑھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر بھی استعمال کر کے مسلمانوں کو اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے برگشتہ کرنے کی جسارت کی ہے اور اس سے بھی زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ کیا خود سوچنے میں سارے مسائل کا حل موجود ہے؟ اگر خود سوچنے کی بات تھی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''افک'' کے معاملہ میں مہینہ بھر کیوں سوچا؟ اور اتنی پریشانی برداشت کی؟ جنگ تبوک سے پیچھے رہنے والوں پر پورے پچاس دن کیوں سختی کی جاتی رہی۔ آپ نے خود سوچ کر اس کا حل کیوں نہ پیش فرما دیا۔(۳)

غلام احمد پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ امت مسلمہ سے تعلق رکھنے والے کروڑوں افراد قرآن اور لغت کے ماہر ہیں اور ان میں سے ہر شخص اتنا ذی استعداد اور باصلاحیت ہے کہ خود سوچ کر اپنے مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اللہ جل شانہ نے سب لوگوں کو ایک جیسی صلاحیت نہیں دی ہے۔ جہاں تک قرآن و حدیث کی آیت و روایات کے فہم صحیح کا تعلق ہے تو اس کا انحصار لغت کی مہارت اور مطالعہ کی وسعت پر نہیں بلکہ اللہ جل شانہ اور اس کے رسول

۱- آئینہ پرویزیت ص ۱۲۸۔

۲- اسباب زوال امت۔ از غلام احمد پرویز ص ۱۰۱۔

۳- تاریخ حدیث۔ ایم۔ اے علوم اسلامیہ (تخصص فی الحدیث ص ۲۰۰)۔

جل شانہ ہدایت و رہنمائی کا یہ سارا نظام کیوں قائم فرماتا؟ کتاب کیوں نازل فرماتا؟ ...... اور انبیاء کیوں مبعوث فرماتا؟ ...... جہاں تک ائمہ اجتہاد کا تعلق ہے تو یہ حضرات بھی ہر معاملہ میں کتاب وسنت کو اپنے اجتہاد کا ماخذ قرار دیتے تھے۔ اگر کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ماخذ قانون بنانے کو ''تقلید'' کا نام دیا جائے تو بلاشبہ یہ سارے حضرات مقلد تھے اور سنت کی تقلید و اتباع ظاہر ہے کہ لازمی اور ضروری ہے۔

سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد غلام احمد پرویز صاحب مقام رسالت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''توحید کے بعد رسالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ختم المرسلین پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے مفہوم اس کی ذات پر ایمان نہیں کیونکہ اس کی ذات تو مکاں و زماں کی حدود کی پابند ہوتی ہے اور ملت اسلامیہ جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے، ابدیت سے ہمکنار ہے۔ رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان سے مقصود اس کتاب پر ایمان ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے امت کو ملی۔ (۱)

جمہور علماء امت کے نزدیک نبی اور رسول میں فرق ہوتا ہے لیکن غلام احمد پرویز صاحب کی تعلیمات کے مطابق نبی اور رسول میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ جو نبی ہے وہ رسول بھی ہے اور جو رسول ہے وہ نبی بھی۔ اس ضمن میں آپ لکھتے ہیں:

''نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ ایک قوت ہے دوسری اس کی عملی تفسیر۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ایک ہی شخصیت کو کہیں نبی کہا گیا ہے اور کہیں رسول۔'' (۲)

ایک طرف تو غلام احمد پرویز صاحب یہ کہتے ہیں کہ نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں لیکن دوسری طرف آپ اس ''ایک حقیقت'' کے دونوں رخوں کو جدا جدا کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی نبوت کو تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ختم کرنا چاہتے ہیں اور رسالت کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اس بارے میں آپ لکھتے ہیں:

''نبوت شخصیت کی مظہر ہوتی ہے اور رسالت آئیڈیالوجی کی نقیب۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ختم ہوگئی مگر رسالت باقی رہ گئی۔ اس لئے کہ اب انقلاب کا مدار رسالت پر تھا نہ کہ شخصیتوں پر۔ آئیڈیالوجی حروف ونقوش کی شکل میں محض مجرد تصور ہوتی ہے۔ اس کی عملی صورت نظام کہلاتی ہے۔ لہٰذا یوں سمجھئے کہ ختم نبوت کے بعد اشخاص کی جگہ نظام نے لے لی۔ مگر رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لئے باقی ہے۔ لیکن مسلمان اس سے دور ہی نہیں بلکہ اس کی راہ میں روک بنا کھڑا ہے۔ اس لئے اس نے رسالت کو ایک عرصہ سے پس پشت ڈال رکھا ہے۔'' (۳)

۱- فردوس گم گشتہ ص ۳۸۳۔
۲- سلیم کے نام سولہواں خط ص ۲۶۴۔
۳- سلیم کے نام چودھواں خط ص ۲۳۵۔

لکھتے ہیں:

''چونکہ نظام دین میں اللہ کے احکام مرکز سے نافذ ہوتے تھے اور یہ مرکزی قوت نافذہ رسول کی مخصوص شخصیت میں تھی اس لئے ان مرکزی احکام کی اطاعت کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قرار دیا گیا۔لہٰذا اللہ اور رسول سے مراد وہ مرکزی نظام دین ہے جہاں سے احکام قرآنی نافذ ہوں۔(۱)

اب ظاہر ہے کہ یہ مرکز ملتی بھی کوئی شخص یا اشخاص کا گروہ ہوگا جن کو اللہ اور رسول دونوں کے جملہ حقوق تفویض کئے جارہے ہیں۔اس ضمن میں ادارہ طلوع اسلام کے ایک اہم رکن ڈاکٹر عبدالودود صاحب کہتے ہیں:

''عملی انتظام کی سہولت کے لئے امت اپنے میں سے بہترین افراد کو نمائندہ بنا کر (فیکم رسول) کے سلسلہ کو قائم رکھتی ہے اور یہ رسول کی زندگی کے بعد (فیکم رسول) سے مراد ملت کی مرکزی اتھارٹی ہے جو رسول کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ادا کرتی ہے اور یہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صرف مرکز ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ دینی امور میں فیصلہ دے۔'' (۲)

غلام احمد پرویز نے یہ تصور بھی پیش کیا ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے مراد قرآن کی اطاعت لیتے ہیں اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے مراد حدیث کی اتباع ہے۔یہ ایک ایسی بات ہے جو سراسر بے بنیاد ہے۔مسلمانوں میں اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی الگ الگ اطاعت کا کوئی تصور نہیں ہے۔بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت عبادت ہے۔قرآن اور اسوۂ حسنہ سے اس طریق اطاعت کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا کوئی تصور مسلمانوں میں موجود نہیں۔غلام احمد پرویز صاحب (اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول والی الامر منکم) کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس آیت مقدسہ میں عام طور پر اولی الامر سے مراد لئے جاتے ہیں ارباب حکومت (مرکزی اور ماتحت سب کے سب) اور اس کی تشریح یوں کی جاتی ہے کہ اگر قوم کی حکومت سے اختلاف ہوجائے تو اس کے تصفیہ کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن (اللہ) اور حدیث (رسول) کو سامنے رکھ کر مناظرہ کیا جائے اور جو ہار جائے فیصلہ اس کے خلاف ہوجائے۔ذرا غور فرمایئے کہ دنیا میں نظام حکومت اس طرح سے قائم رہ سکتا ہے کہ جس میں حالت یہ ہو کہ حکومت ایک قانون نافذ کرے اور جس کا جی چاہے اس کی مخالفت میں کھڑا ہوجائے اور قرآن وحدیث کی کتابیں بغل میں داب کر مناظرہ کا چیلنج دے دے۔اس آیت مقدسہ کا مفہوم بالکل واضح ہے جس میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے

۱- معراج انسانیت ص۶۱۶۔

۲- طلوع اسلام جون ۱۹۵۹ء۔

افسر سے کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو بجائے اس کے کہ وہیں مناقشات شروع کر دو امر متنازع فیہ کو مرکزی حکومت کے سامنے پیش کر دو۔ اسے مرکزی حکومت کی طرف Refer کر دو۔ مرکز کا فیصلہ سب کے لئے واجب التسلیم ہوگا۔ یعنی اس نظام میں مقامی افسروں کے فیصلوں کے خلاف عدالت عالیہ میں مرافعہ (اپیل) کی گنجائش باقی رکھی گئی ہے۔'' (۱)

غلام احمد پرویز نے اپنے لٹریچر میں نظامِ ربوبیت کی اصطلاح کا بہت کثرت کے ساتھ استعمال کیا ہے جس طرح مولانا اسلم جیراج پوری نے مرکز ملت کی خیالی جنت کا تصور پیش کیا ہے اسی طرح پرویز صاحب نے نظامِ ربوبیت کو بنیاد بنایا ہے۔ اس ضمن میں آپ کہتے ہیں:

''میں نے جو گزشتہ صفحات میں لکھا ہے (اور جو کچھ بعد میں آئے گا) اس میں آپ نے ایک چیز کو نمایاں طور پر محسوس کیا ہوگا اور وہ یہ کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی سند میں صرف قرآن کی آیات پیش کی ہیں۔ تاریخ اور روایات سے کچھ نہیں لکھا۔ حتیٰ کہ میں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نظامِ ربوبیت کو متشکل فرمایا ہے اس کے خدوخال کیا تھے...... اور وہ کب تک علیٰ حالہ قائم رہا؟...... ایک بات بالکل واضح ہے اور یہ کہ اگر آپ کو یہ تسلیم ہے کہ جو کچھ ان صفحات میں لکھا گیا ہے وہ قرآن کی رو سے صحیح ہے تو اس کے بعد ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مطابق معاشرہ کی تشکیل فرمائی ہوگی۔ (۲)

غلام احمد پرویز صاحب کہتے ہیں کہ دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے حالات سازگار نہ تھے۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جس زمانہ (چھٹی صدی عیسوی) میں قرآن نازل ہوا ہے، ذہن انسان اپنی پختگی تک نہیں پہنچ چکا تھا۔ اس نے فقط اپنے عہد طفولیت کو چھوڑا تھا۔ اب اسے رفتہ رفتہ پختگی تک پہنچنا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فقید المثال تعلیم اور سیرت سے قرآنی اصولوں کو معاشرہ میں نافذ العمل کر کے دکھایا تھا کہ معلوم ہو جائے کہ یہ اصول ناممکن نہیں۔ لیکن اس زمانہ کی دنیا ہنوز ذہنی طور پر اس سطح پر نہیں آچکی تھی کہ وہ ان اصولوں کو یا ان کی بنیادوں پر قائم کردہ معاشرہ کو شعوری طور پر اپنا سکے۔ یہ چیز ابھی ان کے شعور میں سما ہی نہیں سکتی تھیں۔ اگر مسلمان اسے اسی ''ایمان بالغیب'' کے انداز سے جس سے یہ معاشرہ قائم ہوا تھا آگے چلاتے رہتے تو یہ آگے بڑھتا رہتا لیکن انہوں نے اس طریق کو چھوڑ دیا اور شعوری طور پر دنیا ہنوز اس قابل نہ تھی کہ اسے اختیار کر سکتی۔ لہٰذا یہ نظام ختم ہو گیا۔'' (۳)

۱- معراج انسانیت ص۳۲۲۔
۲- نظامِ ربوبیت ص۲۲۳۔
۳- نظامِ ربوبیت ص۲۲۴۔

س ب م

منکرین حدیث کے مراکز

۱-امرتسر

۱- امرتسر پنجاب کا ایک اہم علمی وتجارتی مرکز تھا۔ نیز یہاں آریہ، مسلم اور عیسائیت کے فروغ کی تنظیمیں اپنے اپنے مذہبی افکار کو باقاعدہ تحریکی صورت میں پھیلا رہی تھیں۔

۲- جب امرتسری مسلم علماء نے مخالف فریقین کے دلائل میں ذہنی اور فکری پسپائی اختیار کی تو سابقہ گمراہ فرقوں (معتزلہ اور خوارج وغیرہ) کے پیش کردہ نظریہ کفایت قرآن کو بنیاد بنا کر انکارِ حدیث کا دروازہ کھول دیا۔

۳- امرتسر میں مولوی غلام علی قصوری بسلسلہ ملازمت تشریف لائے اور یہیں کے ہو رہے۔ ان کی اسلامی تعلیم نامکمل تھی۔ حدیث واصول حدیث سے کماحقہ آگاہ نہیں تھے۔

۴- موصوف نے مدمقابل کے اعتراضات سے بچنے کے لیے حدیث کی صحت اور حجت کا انکار کیا۔ اس مرکز سے وابستہ لوگ عمل تواتر کے قائل رہے۔ امرتسر میں اس فتنہ کی بنیاد موصوف مولوی صاحب نے رکھی اور اس تحریک کو پروان ان کے شاگرد خاص منشی احمد دین نے چڑھایا۔

۵- بیسویں صدی میں بھی امرتسر کی مرکزی حیثیت قائم رہی۔ یہاں منکرین حدیث کی قیادت خواجہ احمد دین کے ہاتھ میں تھی۔

انکارِ حدیث کی ابتداء تو امرتسر سے ہی ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس گروہ کی انتہائی کوشش کے باوجود امرتسر میں اس کو فروغ حاصل نہ ہوسکا اور عام مسلمان اس بادِ سموم سے محفوظ رہے۔

۲- دہلی

بیسویں صدی عیسوی میں انکارِ حدیث کے جراثیم دہلی بھی پہنچ گئے۔ یہاں اس فتنہ کے سرپرست و مربی اسلم جیراجپوری تھے۔ جو کہ جامعہ ملیہ دہلی میں استاد تھے اور غلام احمد پرویز کے بھی مرشد مربی و استاد تھے۔ انہوں نے اپنے افکار و نظریات کو پھیلانے کے لیے کوئی انجمن یا ادارہ قائم نہ کیا۔ ان کی کچھ کتب جامعہ ملیہ دہلی نے شائع کیں اور باقی کی اشاعت ''بلاغ امرتسر'' اور طلوع اسلام دہلی، کراچی اور لاہور نے کی کیونکہ موصوف کے اکثر مضامین ان ہی رسائل میں چھپا کرتے تھے۔

۳-علی گڑھ

علی گڑھ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء جو ترقی پسند کہلاتے تھے، ان کا مرکز تھا۔ یہ لوگ چونکہ انگریزی تہذیب و تمدن اور ان کے فلسفہ ونظریات سے متاثر تھے، ان کی زیادہ تر زندگی انگریز ہی کی ملازمت میں گزری اور یہ لوگ اسلامی علوم

اور تشکیک فی القرآن کے نظریات کو عامۃ الناس میں پھیلایا۔ تاہم علی گڑھ میں شبلی جیسی نابغہ روزگار شخصیات بھی موجود تھیں جو اس سے مستثنیٰ ہیں۔

۴-کراچی

کراچی بھی منکرین حدیث کا ایک اہم مرکز رہا ہے اور ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد پرویز نے کراچی ہی کو اپنا مرکز بنا کر طلوع اسلام اور اپنی دوسری تالیفات شائع کیں۔ بعد ازاں مولوی حبیب الرحمان کاندھلوی اور تمنا عمادی جیسی شخصیات نے بھی انکار حدیث کے نظریات کے فروغ کے لیے کراچی ہی کو اپنا مرکز بنایا۔ ''رحمان پبلشنگ'' ان کے مذموم عقائد کو فروغ دے رہا ہے۔ نگار نیاز فتح پوری کا رسالہ بھی کراچی ہی میں انکارِ حدیث کی تحریک کی زہر پاشی میں مصروف رہا ہے۔

۵-لاہور

انیسویں صدی میں انکارِ حدیث کے معروف مراکز دو تھے۔ لیکن جونہی بیسویں صدی کا آغاز ہوا۔ فتنہ انکارِ حدیث کی وبا نے لاہور جیسے علمی اور تحریکی مرکز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ گزشتہ صدی میں امرتسر، علی گڑھ ہی ان کے مراکز تھے لیکن اب لاہور ان کا تیسرا اور سب سے اہم مرکز بنا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں مولوی عبداللہ چکڑالوی نے لاہور میں ایک انجمن ''اہل الذکر والقرآن'' قائم کی جس کے تحت اپنے نظریات و افکار کا پرچار شروع کیا اور اپنے نظریات کی اشاعت کے لیے رسالہ ''اشاعۃ القرآن'' بھی جاری کیا۔ اس کی وفات کے بعد اس انجمن کو ان کے جانشین اسے چلاتے رہے۔ بالآخر یہ مجلس اور رسالہ اپنی موت آپ مر گیا۔

پرویز نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور ہی کو اپنا مرکز قرار دے کر ''ماہنامہ طلوع اسلام'' جاری کیا جو تا حال جاری ہے۔ قبل ازیں یہ رسالہ کراچی سے شائع ہوتا تھا۔ اس نے اپنے نظریات کے فروغ کے لیے بزمِ طلوع اسلام قائم کی۔

اس بزم و رسالے کا ہیڈ آفس پرویز کی رہائش گاہ ہے۔ جسے ان لوگوں نے ایک ٹرسٹ کی حیثیت دے رکھی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ طلوع اسلام نے اپنے اور ماقبل دور کے تمام اہم ارکان اور ان کے نظریات جو کہ انکارِ حدیث کے متعلق تھے ان تمام کو اپنے اندر سمویا ہے۔ اس کی موجودہ حیثیت انکارِ حدیث کے ایک دائرہ معارف کی سی ہے۔

نظریاتی و اساسی طور پر پرویز، سید احمد خاں کے نظریات و افکار کا ترجمان ہے۔ بلکہ پرویز کے ایک معتقد کے نزدیک تو سرسید احمد خاں کا پرویز کی شکل میں دوسرا جنم ہے (۱)۔ ادارہ طلوع اسلام نے پرویز کی تمام کتب شائع کی ہیں۔

۱- ماہنامہ ''طلوع اسلام'' لاہور، نومبر ۱۹۷۲ء، (عطاءاللہ چوہدری، روح سرسید پیکرِ پرویز میں)، ص ۱۵۔

۴- اسی شہر میں متعدد ادارے اور رسائل معرض وجود میں آئے۔ جنہوں نے بیسویں صدی عیسوی میں انکارِ حدیث کے پھیلانے میں اپنا تن من دھن اور ایمان سب کچھ غارت کیا۔ ان میں معروف ''ماہنامہ بلاغ القرآن لاہور''، ''دوست ایسوسی ایٹس لاہور'' قابل ذکر ہیں۔

۵- مولوی عبداللہ چکڑالوی کے مربی منشی احمد دین نے بھی لاہور میں ایک مجلس قائم کی جس کا نام ''امت مسلمہ'' رکھا جس کے زیر انتظام موصوف کی کتب کی اشاعت بھی ہوئی۔ جب تک وہ زندہ رہے اسی کے تحت لکشمی چوک کے نزدیک ایک ہال میں درس قرآن دیتے رہے جو کہ اسی انجمن کے تحت ہے اور یہ ہال روڈ پر واقع ہے(۱)۔

۱- بیسویں صدی میں کے معروف منکرین حدیث کے افکار کا جائزہ، حافظ عطاء الرحمٰن، ص ۷۵۔

س م

فتنہ انکارِ حدیث کے رد میں لکھی جانے والی کتب

۱-آئینہ پرویزیت،عبدالرحمان کیلانی۔

۲-اتباع سنت،سید بدیع الدین شاہ راشدی۔

۳-اثبات الخبر فی ردمنکری الحدیث والاثر،عبدالستار حسن عمر پوری۔

۴-احادیث صحیح بخاری و مسلم کو مذہبی داستانیں بنانے کی ناکام کوشش،مولانا ارشاد الحق اثری۔

۵-اسلام میں سنت کا مقام،عبدالغفار حسن۔

۶-اسلام میں سنت وحدیث کا مقام،مصطفیٰ حسن السباعی/احمد حسن۔

۷-اسلامی معاشرہ میں سنت کی اہمیت،علامہ محمد اسد/محمد معین خان۔

۸-اقبال اور منکرین حدیث،محمد فرمان۔

۹-انتخابِ حدیث،عبدالغفار حسن عمر پوری۔

۱۰-انکارِ حدیث ایک فتنہ ایک سازش،محمد فرمان۔

۱۱-انکارِ حدیث حق یا باطل،صفی الرحمٰن الاعظمی

۱۲-انکارِ حدیث کے نتائج،محمد سرفراز صفدر۔

۱۳-انکارِ حدیث یا انکارِ رسالت،سید معین الدین۔

۱۴-اہتمام المحدثین،بنقد الحدیث سنداً و متناً،محمد لقمان السلفی۔

۱۵-برق اسلام بجواب رسالہ طلوع اسلام،محمد شرف الدین۔

۱۶-پرویز اور قرآن،مفتی مدار اللہ مدار۔

۱۷-پرویز کا اسلام،منشی عبدالرحمان خان۔

۱۸-پرویز نے کیا سوچا؟ ڈاکٹر سبطین لکھنوی۔

۱۹-تدوین حدیث،مناظر احسن گیلانی۔

۲۰-جمع القرآن والاحادیث،ابوالقاسم بنارسی،تحقیق: ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر،نگہت ہاشمی۔

۲۱-حجیت حدیث،محمد اسماعیل سلفی۔

۲۲-حجیت حدیث،ناصر الدین البانی۔

۲۳-حجیت حدیث،محمد تقی عثمانی۔

۲۴-حجیت حدیث اور اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم،ثناء اللہ امرتسری۔

۲۵-حجیت حدیث (وجوب العمل بسنة الرسول و كفر من انكرها)،عبدالعزیز بن باز۔

۲۶-حجیت حدیث بجواب حقیقت حدیث۔

۲۸- حجیت سنت، مترجم خالد گھرجاکھی۔

۲۹- حجیت سنت، عبدالغنی عبدالخالق۔

۳۰- حجیت السنہ، دکتور محمد لقمان سلفی۔

۳۱- حدیث اور قرآن، ابوالاعلیٰ مودودی۔

۳۲- حدیث کی اہمیت، محمد رفیق۔

۳۳- حدیث کی تدوین عہد صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین میں، حکیم عبدالشکور۔

۳۴- حمایت حدیث، محمد عبداللہ حنیف۔

۳۵- خود انصاف کیجیے بجواب خود فیصلہ کیجئے، مسعود احمد۔

۳۶- دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینہ، ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی۔

۳۷- دفاع حدیث، عبدالرحمان کیلانی۔

۳۸- دلیل الفرقان بجواب اہل القرآن، ثناءاللہ امرتسری۔

۳۹- زوابع فی وجہ السنہ قدیما وحدیثا، صلاح الدین مقبول احمد۔

۴۰- عظمت حدیث، مولانا عبدالغفار حسن۔

۴۱- السنة حجحیتها مکانتها فی الاسلام والرد علی منکریها، محمد لقمان سلفی۔

۴۲- فتنہ انکارِ حدیث، حافظ محمد ایوب دہلوی۔

۴۳- فتنہ انکارِ حدیث، رشید احمد مفتی۔

۴۴- فتنہ انکارِ حدیث، مفتی ولی حسن خاں ٹونکی۔

۴۵- فتنہ انکارِ حدیث اور اس کا پس منظر، محمد عاشق الٰہی مفتی۔

۴۶- فتنہ انکارِ حدیث اور اسلام، عبدالعزیز بن باز/عبدالستار حماد۔

۴۷- فتنہ انکارِ حدیث کا منظر و پس منظر، افتخار احمد بلخی۔

۴۸- قرآنی تعزیرات بجواب پرویزی خرافات، منور حسین سیف الاسلام دہلوی۔

۴۹- قضیة الحدیث فی حجیة الحدیث، ابوالقاسم بنارسی۔

۵۰- کتابت حدیث، منت اللہ رحمانی۔

۵۱- کتابت حدیث عہد تابعین میں، محمد خالد سیف۔

۵۲- کتابت حدیث عہد نبوی میں، ابوبکر غزنوی۔

۵۳- مکتوب لطیف فی حجیت حدیث، محمد سرفراز خاں چوہدری۔

۵۴- منکرین حدیث کا جنازہ مؤاخذہ، سید محمد احسن۔

بابِ سوئم

باب سوم

فصل اوّل:

عبداللہ چکڑالوی کا تصورِ حدیث

فصل دوم:

عبداللہ چکڑالوی کے تصورِ حدیث کا تنقیدی مطالعہ

فصل اول

عبداللہ چکڑالوی کا تصورِ حدیث

مولوی عبداللہ صاحب احادیث نبویہ کو محض ردی کی طرح خیال کرتے تھے اور ایسے الفاظ حدیث کے لئے استعمال کرتے تھے جن کا ذکر کرنا سوءادب میں داخل ہے۔ اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے تھے اور حجیت حدیث کے نہ صرف منکر تھے بلکہ اسے ''شرك فی الكتاب'' قرار دیتے تھے۔ لکھتے ہیں:

''بس کتاب اللہ کے ساتھ شرک کرنے سے یہ مراد ہے کہ جس طرح کتاب اللہ کے احکام کو مانا جاتا ہے اسی طرح کسی اور کتاب یا شخص کے قول یا فعل کو دین اسلام میں مانا جائے، خواہ فرضاً جملہ رسل وانبیاء علیہم السلام کا قول یا فعل بھی کیوں نہ ہو۔ جس طرح شرک موجب عذاب ہے اسی طرح مطابق "ان الحكم الا الله"۔ الاله الحكم والامر اور والایشرك فی حكمه احدا" کے "شرك فی الحكم" یعنی مسائل دین میں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کا حکم ماننا بھی اعمال کا باطل کرنے والا باعث ابدی ودائمی عذاب ہے۔ افسوس شرک فی الحکم میں آج کل لوگ مبتلا ہیں'' (۱)

عبداللہ چکڑالوی کا دعویٰ ہے کہ کل احکام شرعیہ قرآن مجید میں مفصل ومشرح طور پر موجود ہیں۔ اس سلسلے میں فرماتے ہیں کہ ''قرآن شریف میں مجمل مسئلہ کوئی نہیں ہے۔ وہ خود مفصل ہے............کوئی مسئلہ دین اسلام کا قرآن شریف میں مجمل طور پر مذکور وموجود نہیں، سب کے سب مسائل مبین اور مفصل ہیں (۲)۔

چکڑالوی صاحب کا عقیدہ تھا کہ قرآن کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اور کسی قسم کی کوئی وحی نازل نہ ہوتی تھی۔ وحی صرف قرآن مجید ہے۔ وحی خفی کوئی چیز نہیں۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی خفی کے بارے میں سوال کیا گیا تو جواب میں فرماتے ہیں'' نہ کوئی ایسی وحی ہے اور نہ کوئی اس کا نام ہے'' (۳)۔

عبداللہ صاحب کا عقیدہ ہے کہ حدیث اگر قرآن کے مطابق ہے تو قابل قبول ہے اور اگر قرآن کے علاوہ کوئی حکم حدیث سے ملتا ہے تو وہ قابل قبول نہیں، خواہ وہ حدیث متواتر ہی کیوں نہ ہو۔ فرماتے ہیں'' صحیح حدیث کی میزان صرف

۱- ترجمۃ القرآن ص ۹۸۔

۲- اشاعۃ السنۃ نمبر ۵ ج ۱۹ ص ۱۴۸۔

۳- اشاعۃ السنۃ نمبر ۵ ج ۱۹ ص ۱۴۸۔

خواہ متواتر ہی کیوں نہ ہو'' (۱)۔

موصوف کے عقیدہ کے مطابق صرف قرآنی نماز ہی فرض ہے اور دوسری کفر و شرک۔ اس مسئلہ کے متعلق مولوی عبداللہ صاحب نے اپنی کتاب ''برھان الفرقان علی صلوۃ القرآن'' جو آیات قرآنی بطور دلائل پیش کی ہیں ان میں سے ایک آیت درج ذیل ہے:

﴿مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا﴾ (الروم (۳۰):۳۱،۳۲)۔

ترجمہ (عبداللہ چکڑالوی): پناہ کے لئے اللہ کی طرف رجوع کرو اور اس سے ڈرو اور اس کی سکھائی ہوئی نماز قائم رکھو اور شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنی نمازوں کو جدا جدا کر لیا اور گروہ گروہ بن گئے۔

احادیث میں تناقص کا اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں بڑے شوق سے انتظار کروں گا کہ کوئی اہل حدیث صاحب ان حدیثوں میں تطبیق دے بظاہر ان حدیثوں میں بڑا تناقص ہے لیکن حدیثوں میں یہ تناقص ہونا کوئی عجیب بات نہیں۔ آمین اونچی کہنے کی بھی حدیثیں موجود ہیں، آہستہ کہنے کی بھی حدیثیں موجود ہیں۔ ترمذی میں دونوں باب موجود ہیں'' (۲)۔

حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''فی الحقیقت حدیث میں اس قدر لغویات، ہزلیات اور دور از کار اور بے سروپا باتیں مندرج...... واضعین حدیث نے بڑی کاریگری کی کہ اس کو خاتم النبیین کی طرف منسوب کر دیا'' (۳)۔

فرماتے ہیں:

''پس امام بخاری جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی سو سال بعد محض شنید کے بھروسہ پر اس حدیث کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس کے اس منسوب کرنے کو ہم کیونکر صحیح تسلیم کر لیں'' (۴)۔

ویسے تو چکڑالوی صاحب احادیث کو ما انزل اللہ کے خلاف سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ احادیث جو قرآن مجید کے موافق ہیں ان پر عمل کر سکتے ہیں مگر وہ وحی نہیں ہیں۔ پھر حوالہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۱- اشاعۃ السنۃ نمبر ۵، ج ۱۹، ص ۵۳۔

۲- اظہار صداقت، ص ۶۲۔

۳- اظہار صداقت، ص ۵۲۔

۴- اظہار صداقت، ص ۵۶۔

اگر حدیث واجب الاتباع ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے ہرگز مٹانے کا حکم نہ دیتے۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق کے پانچ سو احادیث کے جلانے کا حوالہ دیتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کا مشہور واقعہ قرطاس کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے تین روز پہلے قلم دوات طلب کیا۔ آپ کچھ لکھوانا چاہتے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو درد کی شدت ہے اور ہمارے لئے قرآن کافی ہے (۲)۔

صحیح بخاری پارہ دوم۔ کتاب الحیض کے مضامین پر اعتراض کیا ہے کہ اس میں نامناسب مضامین بیان ہوئے ہیں (۳)۔

چکڑالوی صاحب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سید الانبیاء ہونے کے بھی قائل نہ تھے۔ آپ ایک سائل کو جواب یا فتویٰ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''آپ نے اپنے مسلمہ قرآن اور بخاری اور صحاح ستہ کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبیوں کا سردار لکھا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے متبع اور مقتدی کل انبیاء کا عموماً اور ابراہیم کا خصوصاً لقب مرحمت فرمایا ہے اور پھر آپ نے ان کو نبیوں کا سردار بنا کر دوسرے انبیاء اور رسل کی تحقیر و تذلیل کر کے "لانفرق بین احد من رسله" کا کفر کیا یا نہیں؟'' (۴)

اسی طرح چکڑالوی صاحب معجزات، شفاعت، عذاب قبر، ایصال ثواب اور تعدد ازدواج کے بھی قائل نہ تھے۔

۱- صحیح مسلم کتاب الزهد (والرقائق) باب التثبت فی الحدیث ۔

۲- ملاحظہ ہو اظہارِ صداقت، ص ۹۶، ۹۷۔

۳- اظہارِ صداقت، ص ۵۱۔

۴- اشاعۃ القرآن مئی ۱۹۲۲ء، ص ۱۳۔

عبداللہ چکڑالوی کے تصورحدیث کے اہم نکات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھی وہ صرف قرآن مجید ہی ہے۔قرآن مجید کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کی طرف سے کوئی وحی نازل نہ ہوئی تھی۔

حدیث کو حجت ماننا شرک فی الکتاب ہے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خود احادیث لکھنے سے منع فرمایا تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جو پانچ سو احادیث کا مجموعہ تھا اسے انہوں نے جلا دیا تھا۔

حضرت عمر کے فرمان ''ہمارے لئے قرآن کافی ہے'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ حدیث وحی خفی نہیں۔

امام بخاری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی سو سال بعد احادیث کو جمع کیا۔اس لئے نا قابل اعتماد ہیں۔

جو احادیث قرآن کے مطابق ہوں بس وہی صحیح ہیں۔

بعض احادیث خلاف عقل ہیں۔

بعض احادیث میں آپس میں تناقص ہے۔

بعض احادیث نامناسب مضامین پر مشتمل ہیں۔

واضعین نے احادیث کو خود وضع کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دیا ہے۔

حدیث کی وجہ سے لوگ فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سید الانبیاء نہیں ہیں۔

جہاں ﴿اطیعوا الرسول﴾ آیا ہے اس سے مراد قرآن کی اطاعت ہے۔

کل احکام شرعیہ قرآن مجید میں مفصل و مشرح طور پر موجود ہیں، حدیث کی ضرورت نہیں۔

ل دوم

عبداللہ چکڑالوی کے تصورِ حدیث کا تنقیدی مطالعہ

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآنی وحی کے علاوہ کوئی وحی نازل نہ ہوتی تھی

عبداللہ چکڑالوی کا عقیدہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ کوئی اور وحی نازل نہ ہوتی تھی۔ ذیل میں آیت درج کی جاتی ہے جو اس نظریے کی تردید کرتی ہے کہ وحی صرف قرآن مجید میں ہی محدود ہے۔

﴿وَاِذۡ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعۡضِ اَزۡوَاجِهٖ حَدِیۡثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتۡ بِهٖ وَاَظۡهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیۡهِ عَرَّفَ بَعۡضَهٗ وَاَعۡرَضَ عَنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتۡ مَنۡ اَنۡۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِیَ الۡعَلِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ۝﴾ (التحریم(۶۶)۳)

(اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک بیوی سے راز کی بات کہی پھر اس (بیوی) نے (بات) ظاہر کردی اور اللہ تعالیٰ نے اس (بیوی) کے طرزِ عمل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا کچھ حصہ بتلا دیا اور کچھ سے اعراض کیا۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی بیوی کو خبر دی تو اس نے کہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس نے خبر دی۔ آپ نے کہا مجھے علیم و خبیر نے آگاہ کیا ہے)۔

اس آیت میں اظهره الله علیه اور نبانی العلیم الخبیر۔ یہ دو جملے زیرِ نظر مسئلے میں قابلِ غور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح ظاہر کیا۔ علیم و خبیر کے اطلاع دینے کی نوعیت کیا تھی۔ اس کی تفصیل قرآن میں نہیں ملتی۔ ماننا پڑے گا کہ قرآن کے علاوہ وحی کی کوئی دوسری شکل بھی تھی جسے یہاں اظهره الله علیه اور نبانی العلیم الخبیر سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ قرآن کے علاوہ بھی وحی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اس واقعہ کی اطلاع دی ہے وہ واقعہ قرآن میں مذکور نہیں۔ لہٰذا وحی قرآن کے علاوہ بھی ہے۔

چکڑالوی صاحب وحی کی اتباع کو تسلیم کرتے ہیں۔ لہٰذا اس کی یعنی وحی غیر متلو کی اتباع بھی کرنی چاہئے۔ قرآن کریم کی یہ بنیادی آیت بھی منکرِ حدیث کے اس دعوے کی تردید کرتی ہے۔

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحۡیًا اَوۡ مِنۡ وَّرَآئِ حِجَابٍ......﴾ (الشوریٰ (۴۲):۵۱)۔

قرآن مجید کی لغت کے مشہور امام نے اس آیت میں رؤیا، القاء اور الہام تینوں کو مراد لیا ہے اور قرآن کریم سے یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام نے رؤیا کو واجب العمل ہی جانا ہے۔ حدیبیہ کی طرف سفر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیا کا نتیجہ تھا اور اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:

﴿لَقَدۡ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوۡلَهُ الرُّءۡیَا بِالۡحَقِّ لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیۡنَ﴾ (الفتح (۴۸):۲۷)۔

غور فرمائیں کہ رسول اللہ کے لئے اور مسلمانوں کے لئے رؤیا واجب التعمیل تھی یا نہیں؟ یہ رؤیا وحی خفی کی ایک شکل تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب رؤیا دیکھی کہ آپؑ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ بیٹے سے کہا "یابنی انی اری فی المنام انی اذبحك" بیٹے سے اس کی رائے لیتے ہیں "فانظر ماذا تری" تو فرمانبردار بیٹا کہتا ہے "یاابت افعل ماتؤمر" کہ اے ابا جان آپ کو جو حکم خداوندی ہوا ہے اس کی تعمیل فرمائیں۔ یہاں رؤیا کو ارشاد باری تعالیٰ قرار دیتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآن کے علاوہ بھی وحی ہوتی ہے۔ قرآن کی وحی کو وحی متلو کہا جاتا ہے۔ قرآن کے علاوہ وحی کو وحی غیر متلو یا وحی خفی کہتے ہیں۔ مایوحی الی محمد صرف قرآن مجید ہی نہیں ہے بلکہ خدا کے کلام کی صورت رؤیا مکاشفہ اور القاء بھی ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں جنگ احد کے بارے میں رؤیا ہوئی اور اسی طرح وقوع پذیر ہوا۔ ترتیب قرآن کا تعین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی وحی خفی کے ذریعے سے ہی فرمایا۔ قرآن نے تو یہ کہا تھا اقیموا الصلاۃ لیکن اس کی ادائیگی کا طریق یہ اجتہاد تھا یا خدا کا منشاء؟ مستند تاریخ دین سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ نمازوں کا پہلا اور آخری وقت بھی حضرت جبرئیل نے آکر بتایا تھا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ارکان اسلام کی ادائیگی کا طریق اور قرآن کی ترتیب کا تعین وحی خفی کے ذریعے ہی کیا گیا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ قرآن کریم ایک خاص وحی، وحی متلو ہے۔ اس کی ہر قسم کی حفاظت کا وعدہ خدا تعالیٰ نے اپنے ذمے لیا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام آپ کی رؤیا اور مکاشفات وحی سے خارج نہیں بلکہ اس کی تعبیر اور تبین ہیں جو ہر مسلمان کے لئے واجب الاتباع ہیں۔

صدہا مسائل ہیں جو قرآن میں موجود نہیں صرف حدیث نبوی میں ان مسائل کا حکم پایا جاتا ہے اور مسلمان قرون اولیٰ سے لے کر آج تک بلا اختلاف ان احکام پر عمل کر رہے ہیں۔ اُن مسائل کے متعلق قرآن کریم نے کوئی فیصلہ نہیں کیا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی غیر متلو یا وحی خفی سے فیض پا کر صرف اپنی حدیث سے اُن مسائل کی نسبت احکام صادر فرمائے۔ مثلاً:

بیوی کے ساتھ اس کی خالہ یا پھوپھی کو نکاح میں جمع نہ کیا جائے۔

قاتل اپنے مقتول کا وارث نہیں ہوتا۔

مختلف مذاہب کے لوگ آپس میں وارث نہیں ہوتے۔

گدھا حرام ہے۔ وغیرہ وغیرہ

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واجب نہیں

حدیث کو حجت تسلیم کرنے سے قرآن کا ناحق اور غیر کافی ہونا لازم نہیں آتا، نہ ہی یہ شرک فی الکتاب ہے۔ جب قرآن میں واضح طور پر حکم وراد ہے کہ رسول کی اطاعت کرو۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس قدر احکام رسول اللہ نے احادیث

کوزہ میں بند اور حدیث شرح کرنے والی اور دریا کے پانی کو پھیلانے والی ہے۔ایک اور آیت جو اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے یہ ہے کہ:

﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔﴾ (نحل (١٦):٤٤)۔

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے تیری طرف قرآن مجید نازل کیا ہے۔آپ لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کریں تاکہ یہ لوگ تدبر کریں۔

یہاں رسول کو قرآن مجید کا متبین یعنی وضاحت کرنے والا بیان کیا گیا ہے۔عجیب بات ہے کہ چکڑالوی صاحب قرآن کی اپنی وضاحت تو قبول کرنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحت کو ضروری نہیں سمجھتے۔ حالانکہ خدا کے قول کو سب سے بہتر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے تھے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں قرآن نہ سمجھاتے تو نہ جانے ہم اس کی کیا کیا تشریح کر لیتے۔

یہ خدا تعالیٰ کی سنت ہے کہ اُس کے انبیاء اُس کے قول کے شارح اور مفسر ہوتے ہیں۔دین کی جو وہ تشریح کرتے ہیں وہ عین منشاء خداوندی ہوتا ہے۔دین کے بارے میں ان کا منطوق خدا تعالیٰ کا مقصد ہوتا ہے۔یہ آیت بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے:

﴿مَايَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىO اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی﴾ (نجم (٥٣):٣،٤)۔

پس دین کو دین کے لانے والے ہی سے سیکھو کہ دین کا معلم اس سے بہتر کون ہوسکتا ہے۔اگر کلام کے بھیجنے والے کا احترام ہے تو اُس کے پیغامبر کا بھی احترام کرو۔اس کا انکار خدا تعالیٰ کا انکار ہے۔اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ۔﴾ (نساء (٤):١٥٠)۔

''جو لوگ اللہ اور رسول کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرتے ہیں (معنی ہیں جدا جدا کرنا) اور کہتے ہیں کچھ کو مانیں گے، کچھ کا انکار کریں گے۔''

اس آیت میں بڑی وضاحت سے منکرین حدیث کا نقشہ کھینچا گیا اور اس کے رسولوں میں تعمیل ارشاد کے لحاظ سے تفریق کرنا یہ خدا ہی کی کچھ نہ ماننے کے مترادف ہے۔اُسی نے کہا ہے:

یایها الذین امنوا استجیبوا الله وللرسول اذا دعاك لما"

خدا کی آواز کے ساتھ اُس کے رسول کی آواز پر کان دھرو۔خدا کا رسول دین کا معلم ہوتا ہے اور کسی فرمانبردار شاگرد کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ استاد کے کلام سے انحراف کرے کیونکہ وہ منشاء خداوندی سمجھانے کے لئے آتا ہے۔ارشاد خداوندی ہے کہ وہ آیات کی تلاوت بھی امت پر کرتا ہے اپنے انفاس قدسیہ سے اُن کا تزکیہ بھی کرتا ہے اور کتاب کے متن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کا فلسفہ بھی سکھاتا ہے۔

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (نساء(۴)۶۵)

تیرے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہ ہوں گے جب تک تجھے اپنے تنازعات میں حاکم نہ بنائیں اور پھر جو تو فیصلہ کرے اور حکم دے اس سے اپنے دل میں تنگی نہ پائیں اور مان لیں۔

اللہ تعالیٰ نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو امر و نہی کا حق دیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿مَآ اٰتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ (حشر(۵۹)۷)

رسول جو (حکم) دے وہ لے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ۔

﴿مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ (احزاب(۳۳):۳۶)۔

مومن مرد یا عورت کی شان نہیں کہ جب خدا اور اس کا رسول کوئی حکم دیں تو اُن کو اُس کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار باقی رہے۔

یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کی نسبت نازل ہوئی تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب اور اس کے بھائی کو دیا تھا کہ زینب کو زید بن حارثہ کے نکاح میں دیا جائے۔ ان آیات میں صاف تصریح ہے کہ آنحضرت کو تشریع کا منصب حاصل ہے جو آپ حرام کریں وہ حرام ہے، جو حلال کریں وہ حلال ہے اور آپ کے حکم کی اطاعت ایسی ہی واجب ہے جیسے حکم خدا کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی نافرمانی موجب عذاب ہے۔ ارشاد نبوی ہے

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ماتمسکتم بھما کتاب اللہ سنتی۔ (۱)۔

میں تم لوگوں کے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں تھامے رہو گے تو گمراہ نہ ہو گے۔ ایک کتاب اللہ دوسری سنت میری۔

ہر صورت میں نبی کا قول حجت ہے۔ نبی کا قول مستقل حجت ہے۔ غیر مشروط حجت ہے۔ نبی کے قول کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو۔ تب تو حجت رہے اور اگر قرآن کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے۔ یہ شرط غیر نبی کے لیے ہے کہ اگر غیر نبی کا قول قرآن کے مطابق ہے تو بے شک ہر غیر نبی کا قول حجت ہے۔ اگر قرآن کے مطابق نہیں تو ہر غیر نبی کا قول حجت نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح قرآن کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہماری عقل کے مطابق ہو تو حجت ہے اور ہماری عقل کے مطابق نہ ہو تو حجت ہے۔ اسی طرح نبی کے قول کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تو حجت ہو اور قرآن کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن کا حجت ہونا اس بناء پر ہے کہ وہ من جانب اللہ ہے۔ صرف من جانب اللہ ہونا قرآن

۱۔ مشکوۃ کتاب المناسک۔ باب قصۃ حجۃ الوداع

اللہ ہوتا ہے۔لہٰذا نبی کا قول اور نبی مستقل حجت ہے۔

اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی اور قول نبی من جانب اللہ ہے اور ہر وہ شے جو من جانب اللہ ہے قابل قبول ہے اور حجتِ عمل ہے۔ نبی کا قول قول الٰہی ہے۔اس آیت سے بھی ثابت ہے ﴿قُلْ مَایَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَہٗ مِنْ تِلْقَآیِٔ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَایُوْحٰی اِلَیَّ﴾ (سورۃ یونس (۱۰):۱۵)۔کہہ دے کہ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں اپنی طرف سے تبدیل کردوں۔میں تو صرف وحی کا پیرو ہوں۔صاف ظاہر ہوگیا کہ نبی قول وحی ہے اور یہ من جانب اللہ ہے۔

اگر نبی کا قول قرآن کے خلاف ہو تو وہ بھی حجت ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے ﴿کُتِبَ علیکم اِذ حَضَرَ احدکم الموت اِن تَرَکَ خَیْرَنِ الْوَصِیَّۃُ لِلْوَالِدَیْنِ﴾ (البقرۃ (۲) ۱۸۰) تمہارے اوپر والدین کے لیے وصیت فرض ہے۔اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آئے'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لَا وَصِیَّۃَ لِلْوَارِثِ" وارث کے لیے وصیت نہیں ہے۔اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔یعنی وارث کے لیے وصیت ناجائز قرار دی گئی ہے۔حدیث نے قرآن کی آیت کو منسوخ کر دیا۔اور قول رسول قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجب عمل رہا۔لہٰذا قول رسول حجت مستقل اور غیر مشروط حجت ہے۔اگر کہا جائے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رسول کا کوئی قول قرآن کے خلاف ہو اور رسول کا قول قرآن کو نسخ کردے تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ رسول کا قول اس کا اپنا قول نہیں ہوتا۔وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے۔جس طرح قرآن خدا کا قول ہے اسی طرح رسول کا قول بھی خدا کا قول ہے۔جس طرح قرآن کی ایک آیت قرآن کی دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے اسی طرح خدا کے ایک قول یعنی قول رسول دوسرے قول یعنی قرآن کو منسوخ کر دیتا ہے۔تعجب کا باعث صرف یہ ہے کہ رسول کے قول کو ایک عام بشر کا قول سمجھا جا رہا ہے۔ ﴿ماینطق عن الھوی ان ھوالا وحی یوحی﴾ (النجم (۵۳):۴)۔وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا اس کا بولنا صرف وہ وحی ہے جو اس پر کی گئی ہے۔

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار کہا کہ میں اللہ کا رسول ہوں میرا کہنا مانو اور ابھی کتاب نازل نہ ہوئی تھی یا نازل تو ہوئی تھی ایک دو آیتیں، جس میں نبی کی پیروی کا ذکر نہیں ہے، اس وقت نبی کا قول ماننے کے قابل ہے یا نہیں۔اگر کہا جائے کہ ماننے کے قابل نہیں ہے تو کفر کے مرتکب ہوئے اور اگر کہا جائے کہ ماننے کے قابل ہے تو نبی کا قول مطلقاً حجت ہوگیا۔

حدیث کو حجت ماننا شرک فی الکتاب ہے

جہاں اطیعوا الرسول آیا ہے اس سے مراد قرآن ہے

قرآن کریم، حدیث شریف اور امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر رسول اور نبی اپنی امت کے لئے نمونہ ہوتا ہے۔اسوہ ہوتا ہے۔اس کا قول وفعل (جو لغزش اور تخصیص کی مد میں نہ ہو) تمام امتیوں کے لئے لازم ہوتا ہے اور اس کی

مقتدیٰ ہو کر آتا ہے اور امت مطیع اور مقتدی کہلاتی ہے۔

جب ان کا حکم تسلیم کرنا ضروری ہے تو پھر بھلا وہ شرک کیسے ہو سکتا ہے؟ اس پر قرآن کریم کی متعدد آیات دلیل ہیں۔ مثلاً:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (نساء(۴)۶۴)

''یعنی ہم نے کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا جو خدا تعالیٰ کے حکم سے مطاع ہو کر نہ آیا ہو'' لیکن عبداللہ چکڑالوی کچھ اور ہی کہتے ہیں کہ:

> ''پس کتاب اللہ کے ساتھ شرک کرنے سے یہ مراد ہے کہ جس طرح کتاب اللہ کے احکام کو مانا جاتا ہے اسی طرح کسی اور کتاب یا شخص کے قول و فعل کو دین اسلام میں مانا جائے خواہ فرضاً جملہ رسل وانبیاء کا قول یا فعل ہی کیوں نہ ہو۔ جس طرح شرک موجب عذاب ہے اسی طرح مطابق "ان الحکم الا اللہ" اور ''الا لہ الحکم والامر" اور "ولا یشرک فی حکم احدا" کے شرک فی الحکم یعنی مسائل دین میں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کا حکم ماننا بھی اعمال کا باطل کرنے والا باعث ابدی و دائمی عذاب ہے۔ افسوس شرک فی الحکم میں آج کل اکثر لوگ مبتلا ہیں۔'' (۱)
>
> ''چکڑالوی صاحب کی یہ تحقیق انیق یا جہل ملاحظہ کیجئے کہ نبی اور رسول کا اسوہ حسنہ اور اس کا قول و فعل جو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے نہ صرف یہ کہ وہ شرک فی الحکم ہے بلکہ باعث ابدی و دائمی عذاب ہے اور آج کل اکثر لوگ اس میں مبتلا ہیں اور ان الحکم الا اللہ وغیرھا جن آیات سے استدلال کیا ہے وہ عجیب وغریب ہے کیونکہ رسول اور نبی کا حکم جو بحیثیت رسالت و نبوت ہوتا ہے وہ خدا تعالیٰ ہی کا حکم ہوتا ہے۔

وما ینطق عن الھو ان الاوحی یوحی اس کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مدمقابل لا کھڑا کرنا یا اس کو سوائے اللہ تعالیٰ کے حکم کے اور کا حکم کہنا نری حماقت اور نادانی ہے۔ اگر نبی اور رسول کا ذاتی اجتہاد بھی ہو اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ نازل نہ ہوئی ہو تو بھی وہ حسب مراتب امت کے لئے لازم ہے کیونکہ خطا اور لغزش پر نبی کو کبھی منجانب اللہ برقرار نہیں رکھا جاتا۔ بخلاف دیگر مجتہدین کے کہ مدت العمر بھی وہ خطا کا شکار رہ سکتے ہیں لیکن نبی اور رسول چونکہ معصوم ہوتے ہیں اس لئے ان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ (۲)

چکڑالوی صاحب کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آئی کہ قرآن مجید بھی تو رسول اللہ کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں۔ اسی زبان مبارک سے قرآن مجید نکلا اور کلام الٰہی کے نام سے نامزد ہوا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ نبی کو قرآن لانے میں تو ہم

۱- ترجمۃ القرآن ص ۹۸۔

۲- انکار حدیث کے نتائج۔ از محمد سرفراز ص ۳۴ تا ۳۵۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرو۔ اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔'' تو ہم اس کی اس بات پر یقین نہ کریں بلکہ اس کے اسوہ حسنہ کی پیروی کو غیر ضروری قرار دے دیں۔

افسوس کہ چکڑالوی صاحب پاک اور معصوم نبی خاتم النبیین رحمت للعالمین کی متابعت اور اطاعت کو کفر سمجھنے لگ گئے اور پھر طرفہ یہ کہ دعویٰ اہل قرآن ہونے کا ہے۔

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔﴾ (نساء(۴):۵۹)۔

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن کی جو تم میں سے صاحب حکم ہوں۔

چکڑالوی صاحب کہتے ہیں کہ رسول سے مراد قرآن ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے خود ہی فیصلہ فرما دیا ہے کہ وہ رسول ''منکم'' یعنی تم میں سے ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَمَآاٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَانَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ۔ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ۔﴾
(حشر(۵۹):۷)۔

''اور جس چیز کے لینے کے لئے (محمد) رسول (اللہ) تم کو حکم کریں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اس سے منع ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔''

اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ رسول لوگوں کو جس بات کا حکم دیں لوگ وہی کریں اور جس بات سے رسول روکیں وہ اس بات سے رک جائیں۔ رسول اللہ کو احکام دینے کا اختیار خود اللہ تعالیٰ نے ہی دیا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی خدا کی مرضی تھی اور جو کچھ وہ کرتے تھے خدا کے حکم سے کرتے تھے اور ان کا جینا اور مرنا سب خدا کے لئے تھا۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿من یطع الرسول فقد اطاع اللہ﴾ (نساء)

جس نے اطاعت کی (محمد) رسول (اللہ) کی پس اس نے اطاعت کی اللہ کی۔

اس سے بات واضح ہے کہ حکم صرف اللہ کریم کا ہی ہے اور ہمیں صرف وہی کام کرنا چاہئے جو اللہ کا حکم ہو اور یہ اللہ کریم کا ہی حکم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جائے۔

سنت اور حدیث نہ تو خدا کے حکم کے سوا ہے نہ اس کے مخالف اور متضاد بلکہ حدیث خدا تعالیٰ ہی کا حکم ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض رساں اور عمل سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس لئے حدیث کے مطابق حکم کرنے والا تو ہرگز کافر، ظالم اور فاسق نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ ہاں البتہ خدا تعالیٰ کے رسول کے حکم کو ترک اور سنت سے اعراض کر کے کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خود احادیث لکھنے سے منع فرمایا تھا

اصل امر یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی ایام میں کتابت حدیث سے اس لئے منع کیا گیا تھا کہ قرآن کے ساتھ التباس نہ ہو جائے۔ اس لئے بعض نے تو یہ کہا ہے کہ حدیث کی کتابت کا حکم امتناعی صرف کاتبین کو تھا لیکن اگر اس حکم کو عام مانا بھی جائے تو یہ حکم اس لئے تھا کہ ابھی ذہن پورے طور پر قرآن اور حدیث میں امتیاز نہ کر سکتا تھا اور التباس کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ ایک حدیث میں الفاظ منع وارد ہی ان واضح معنوں میں ہوئے ہیں۔

فرمایا: اکتاب مع کتاب الله امفضوا کتاب الله واخلصوه کہ "خدا کی کتاب کے ساتھ لکھتے ہو۔ خدا کی کتاب کے ساتھ کسی چیز کی ملاوٹ نہ ہوا سے خالص رہنے دو۔" لہٰذا اس کے لکھنے سے منع فرمایا اور جب اور جہاں اختلاط اور التباس کا اندیشہ نہ رہا اس وقت اس کے لکھنے کی اجازت دے دی۔ جب قرآن مجید نے اصحاب نبوی کے دل و دماغ میں جگہ پکڑ لی اور حدیث و قرآن میں ان کو تمیز ہو گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لکھنے کی اجازت دے دی۔

اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی مدنظر رہے کہ عربوں کے لئے علوم کی حفاظت کا بڑا ذریعہ ان کی قوت یادداشت تھی۔ جو شخص اُن کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے اس سے یہ امر مخفی نہیں۔ اس حدیث میں ان کے اس نمایاں اور نادر وصف کو قائم رکھنے کے لئے ارشاد ہے کہ حفاظت حدیث کے لئے لکھنے کا رواج عام کر کے اپنے حافظے کو کمزور نہ کرو۔ حدیث میں الفاظ مذکورہ بالا کے بعد یہ الفاظ ہیں:

"حدثوا عنی والاحرج ومن کذب علی متعمدا فلتبوا معقده من النار۔" (۱)

یعنی قرآن کے علاوہ کچھ اور نہ لکھو لیکن میرے ارشادات کو آگے پھیلاؤ اس میں کوئی حرج نہیں ہاں میری طرف غلط بات منسوب نہ ہو۔

مستند دینی تاریخ سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ارشادات دیار و امصار میں بھجوانے کے لئے تحریر کروائے۔

بادشاہوں کو تبلیغی خطوط تحریر فرمائے، معاہدات تحریر فرمائے، صحابہ کرام احادیث آپ سے قلم بند کرتے اور آپ کو سناتے۔ بعض صحابہ کبار نے احادیث کے لئے نوٹ بک بنائی ہوئی تھی جس میں احادیث نقل کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کی شکایت پر کہ مجھے آپ کے ارشادات یاد نہیں رہتے فرمایا "لکھ لیا کرو"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن حرم محترم کے بعض احکام جو قرآن مجید میں نہیں ہیں بیان فرمائے تو یمن کے ایک شخص ابوشاہ نامی نے سوال کیا کہ مجھے یہ احکام لکھوا دیئے جائیں۔ آپ نے یہ حکم دیا کہ ابوشاہ کو یہ احکام لکھ دو۔ (۲)

یہ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر کا ہے۔ چنانچہ اس تاریخی واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور عالم امام

۱- صحیح مسلم۔ باب التثبت فی الحدیث

۲- ترمذی ابواب العلم

هذا التصريح بجواز كتابة العلم غير القرآن و مثله حديث.......... ان النهى تنزيه عن يوثق بحفظه وخيف الكاله على الكتابه والاذن عن يوثق بحفظه (۱)۔

ترجمہ: ''ابوشاہ کا واقعہ قرآن کے علاوہ علوم کی کتابت کی بڑی واضح دلیل ہے۔ اس مفہوم کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جس میں یہ آیا ہے کہ میرے صحیفہ میں چند احادیث منقول ہیں اور حضرت ابو ہریرہ سے بھی اسی مضمون کی حدیث مروی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر احادیث لکھا کرتے تھے اور میں نہ لکھا کرتا تھا اور قرآن کے علاوہ دوسرے علوم کی کتابت سے منع کا حکم بھی آیا ہے۔ اس لئے بعض تو اس کے قائل ہیں لیکن جمہور اسلاف لکھنے کے جواز کے قائل تھے اور اس کے بعد علوم کو ضبط تحریر میں لانے کو پسندیدہ ہی خیال کیا ہے اور جن احادیث میں لکھنے سے منع کیا گیا ہے اُن کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ احادیث پہلے کی ہیں اور جواز کی احادیث بعد کی مروی ہیں۔ یہ قرآن کے مشتہر ہونے سے پہلے تھی تا کہ قرآن کے ساتھ اختلاط اور اشتباہ نہ ہو اور جب قرآن مشتہر ہو گیا اس خرابی کا اندیشہ نہ رہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھنے کی اجازت فرما دی اور نہی کی احادیث کا یہ جواب دیا گیا کہ ایسا نہ کیا جائے اور حافظے پر زور دیا جائے اور علوم کی حفاظت کے لئے تحریر پر ہی بھروسہ نہ کیا جائے۔

پس معلوم ہوا کہ منع کتابت کا حکم مستقل نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کبار صحابہ احادیث قلمبند کرتے تھے اور یہ کیسے باور کیا جاتا ہے کہ یہ بزرگان جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں بسر ہوتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک واضح حکم کی نافرمانی کرتے۔

ابورافع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ انہیں احادیث لکھنے کی اجازت تھی۔

مدینہ میں تشریف آوری پر مہاجرین، انصار اور یہود سے مشورہ کے بعد ایک دستورِ مملکت نافذ کیا گیا تھا جس میں حاکم ومحکوم دونوں کے حقوق کی واجبات کی تفصیل ہے۔ تاریخ میں میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہے اس کے علاوہ صلح حدیبیہ، مدینہ کے گردونواح کے قبائل سے دوستی کے معاہدات وغیرہ (۲)۔

رسول اللہ نے جب حضرت عمر بن حزم کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو ان کے لئے ایک صحیفہ تحریر کروایا اس میں طہارت، صلوٰۃ، حج اور امارت سے متعلق ہدایات تھیں (۳)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف افراد کو مختلف اوقات میں کچھ زمینیں، باغات، کانیں وغیرہ عنایت فرمائیں۔ یہ اجازت نامے بھی تحریری شکل میں موجود ہیں۔

یہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر کروائے تھے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حکم کے خلاف

۱- نووی زیر باب تحریم مکہ

۲- الوثائق السیاسیہ۔ از ڈاکٹر حمید اللہ

۳- ایضاً

عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بجستان لکھ کر ہدایات بھجوائی تھیں (۱)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک صحیفہ احادیث کا تھا (۲)۔

حضرت ابوعبداللہ بن اونی رضی اللہ عنہ حدیثیں لکھا کرتے تھے (۳)۔

حضرت سعد بن عبادہ کے پاس تحریری احادیث تھیں (۴)۔

سحرۃ بن جندب نے احادیث جمع کی تھیں۔عبداللہ بن عمرو بن عاص نے الصحیفہ الصادقہ کو ترتیب دیا جس میں ایک ہزار احادیث تھیں (۵)۔

سعد بن ابی مشہور شہید احد کا ذکر اسد الغابہ میں آتا ہے۔انہیں حضرت ابن عباس احادیث املا کرواتے تھے۔(۶)

مشہور صحابی حضرت مغیرہ بن شعبہ نے جو کسریٰ کے دربار میں نمائندہ بنا کر بھجوائے گئے تھے۔حضرت معاویہ کے دریافت کرنے پر بعض احادیث سے املا کر کے روانہ کی تھی (۷)۔

قرآن کو دستور حیات کہنے والے یہ بھی تو غور فرمائیں کہ قرض کے بارہ میں تو اسلام کا حکم ہے کہ لکھ لیا کرو تا کہ تنازعہ اور اختلاف کے وقت فیصلہ کرنے میں آسانی رہے۔تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے تنازعات کے وقت ان کی احادیث کی طرف رجوع کیوں نہ کیا جائے اور ان کو تحریر میں کیوں نہ لایا جائے۔خود خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِ﴾ (نساء(۴):۵۹)۔

اور کیا یہ حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک کے لئے ہی تھا یا آج بھی قابل عمل ہے۔آج رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تنازعات طے کروانے کی اس کے علاوہ اور کیا صورت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو اپنے مسلک کے معیار و محک بنائیں اور اپنے مسائل کو قرآن وسنت کی روشنی میں حل کریں۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس چند احکامِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ایک پرچہ پر لکھے ہوئے تھے جس کو آپ تلوار کے میان میں رکھتے۔کسی نے آپ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے احکام بھی فرمائے ہیں جو قرآن میں نہ ہوں۔بجز ان احکام کے جو اس پرچہ میں ہیں اور احکام میرے پاس نہیں ہیں۔حضرت علی نے جواب دیا۔''

۱- صحیح بخاری کتاب الاحکام۔باب ھل یقضی القاضی اویفتی وھو غضبان

۲- جامع صحیح البخاری کتاب العلم

۳- جامع صحیح البخاری کتاب المغازی

۴- طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۹،۸

۵- ایضاً

۶- جامع ترمذی کتاب العلم

۷- جامع صحیح البخاری باب الذکر بعد الصلاۃ

الله، اوفهم اعطيه رجل مسلم، او ما في هذِهِ الصحيفةِ، قال: قُلْتُ: وما في هذِهِ الصحيفةِ؟ قال: العقل، وفكاك الاسير، ولا يُقْتَلُ مسلم بكافِرٍ (۱)

اس سے ثابت ہے کہ احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں لکھی جاتی تھیں لیکن دوسری تیسری صدی میں ان کے باقاعدہ جمع کرنے کا کام شروع ہوا۔

احادیث کے ناقابل اعتبار ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ ابتدا میں تحریر میں نہیں لائی گئیں ہیں بلکہ زبانی سلسلہ روایت سے ہی محدثین تک پہنچی ہیں۔

ایسی احادیث بکثرت موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بعض لوگ احادیث لکھ لیا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لکھنے کا رواج اور زیادہ ہو گیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی احادیث کے لکھنے سے روکا تھا اور آپ کا اس ممانعت سے یہی مطلب تھا کہ عام طور پر حدیث کو نہ لکھا جائے جس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ قرآن جیسے جیسے نازل ہوتا تھا لکھا جاتا تھا اور اس کا لکھنا ضروری تھا۔ اس لیے اس اندیشہ سے کہ مبادا حدیث کے عام طور پر لکھنے سے قرآن اور حدیث غلط ملط نہ ہو جائیں آپ نے حدیث کے لکھنے کی ممانعت کی اور جہاں ایسا اندیشہ نہ تھا وہاں لکھنے کی اجازت بھی دی۔ کیونکہ آپ کی اجازت سے حدیثوں کا لکھا جانا بھی ثابت ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ احادیث میں زیادہ تر اعمال کا ذکر ہے۔ اعمال ایسی چیز ہیں کہ وہ پڑھنے پڑھانے سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے۔ اعمال تو کرنے کی چیز ہیں۔ اس لیے عمل کو لکھوایا نہیں بلکہ عمل کی پریکٹس (مشق) کرادی۔ عمل کو پڑھوانا یا لکھوانا مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ عمل کو تو کرانا مقصود ہوتا ہے۔ اس لیے حدیث پر عمل کروایا اور اس کی مشق کرادی۔ فرمایا "صَلُّوا كمارَ ائَيتموني اُصَلِّي" جس طرح میں نماز پڑھتا ہوں اسی طرح تم بھی نماز پڑھو۔ یعنی عمل کی مشق کرائی۔ یہ نہیں کہا کہ صرف اس حدیث کو یاد کر کے لکھ لو۔

عام طور پر حدیث کے لکھے جانے میں ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ اگر احادیث کے لکھنے کا رواج ہو جاتا تو حدیث کو زبانی یاد رکھنے کی ضرورت بالکل مفقود ہو جاتی اور اس طرح زبانی روایت کا سلسلہ قطعاً موقوف ہو کر صرف یادداشتوں پر حدیث کی بناء رہ جاتی۔ جس میں جعل سازی کی گنجائش بہت زیادہ ہوتی ہے۔

اگر کسی حدیث کے متعلق سلسلہ روایت کو چھوڑ کر صرف اسی قدر پر اکتفا کیا جاتا کہ یہ حدیث کسی پرانی یادداشت سے لی گئی ہے تو اول تو تحقیق کا دروازہ بند ہو جاتا، کیونکہ سلسلہ روایت کے معلوم ہونے سے تو حدیث پر جرح بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن صرف ایک پرانی یادداشت کا حوالہ دینے سے آئندہ نسلوں کو یہ کیونکر معلوم ہوتا کہ فلاں یادداشت واقعی فلاں صحابی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی یا بعد میں کسی نے جعل سازی کی ہے۔ کیونکہ زبانی سلسلہ میں تو ہر راوی کا نام ظاہر کرنا پڑتا ہے اور

۱- جامع صحیح البخاری کتاب العلم۔ باب کتابۃ العلم

رواج نہ تھا اور اس لیے عام طور پر کوئی تحریر مشتہر نہ ہو سکتی تھی کہ سب لوگ یقین کر لیں کہ فلاں بات کے لکھنے والا واقعی فلاں شخص ہے۔ ایسے زمانے اور ان حالات میں اگر تحریری یادداشتوں سے حدیثیں جمع کی جاتیں تو وہ ایسی مشتبہ ہو جاتیں کہ بالکل ناقابل اعتبار ہوتیں۔

علاوہ ازیں محدثین خود کب اس بات پر مطمئن ہو سکتے تھے کہ ایک یادداشت ان کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ کیونکہ اس میں وہ خود اپنی تنقید سے کام نہیں لے سکتے تھے۔ بلکہ لازماً سلسلہ رواۃ کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ جب تک راویوں کے ذریعہ سے کوئی حدیث کسی صحابی تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک وہ قطعاً اس کے متعلق مطمئن نہ ہو سکتے تھے۔ تحریری یادداشتیں اصل میں ابتداء میں بھی حافظہ کو تازہ کرنے کے لیے تھیں اور محدثین نے بھی ان سے یہی کام لیا۔ یعنی ان کو بطور تائیدی شہادت قبول کیا۔

حضرت ابوبکر کے پاس پانچ سو احادیث کا مجموعہ تھا جسے آپ رضی اللہ عنہ نے جلا دیا تھا

ایک اعتراض یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مجموعہ حدیث تھا جس کو انہوں نے جلا ڈالا تھا۔

اس روایت کے بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی سند قابل اعتماد نہیں ہے۔ اس روایت کے راویوں میں ایک صاحب علی بن صالح مدنی ہیں جن کے بارے میں محدثین نے کہا ہے کہ وہ مستور الحال ہیں۔ یعنی ان کے احوال و کوائف معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ اس لئے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا (۱)۔

حافظ ذہبی نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس پر سند کے لحاظ سے تنقید بھی کر دی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ حامیان انکار حدیث اس روایت کو تو اپنی کتابوں رسالوں میں نقل کر دیتے ہیں لیکن سند پر مصنف کی جرح کو گول کر جاتے ہیں۔ آخر یہ کہاں کی دیانت اور کہاں کا انصاف ہے (۲)۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے احادیث کے مجموعہ کو جلا دیا تھا معلوم ہوا آپ نہ چاہتے تھے کہ احادیث کو جمع کیا جائے۔ ہمیں خلفاء راشدین کی اتباع کا حکم ہے لیکن ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اصل معاملہ کیا ہے اور ایسا کیوں ہوا ہے؟

کیا کوئی مسلمان یہ مان سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کو سب سے بہتر سمجھنے والے، حضرت ابوبکر صدیق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو جلا دیں۔ کیا یہ اس لئے جلائے گئے تھے کہ رسول اللہ کے ارشادات ہیں یا کوئی اور احتیاط مدنظر تھی۔ منکرین حدیث بھی اس دوسری بات یا وجہ کو درست قرار دیتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو دو اسلام ص ۶۲) چنانچہ تاریخ کی کتب میں اس کی وجہ یہی بیان کی گئی ہے "خشیت ان اموت عندی فیکون فیھا احادیث ان رجل قد...... وثقة ولم یاکن کما حدثی فاکون قدنقلت ذلك فلا یصح" (۳)

"مجھے اس بات سے خوف ہوا کہ مجھے اس حالت میں وفات آئے کہ میرے پاس یہ احادیث ہوں جنہیں میں

۱- تقریب التہذیب۔ ص ۲۷۲۔ ج ۱

۲- عظمت حدیث ص ۲۷، ۲۸

۳- تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۵

نے نقل کردیں تو یہ صحیح نہیں۔'' یہ حوالہ واضح طور پر بتلا رہا ہے کہ آپ نے وہ احادیث اس لئے جلا دیں کہ وہ مجموعہ قابل اعتماد نہ تھا۔ آپ نے فرمایا خدا جانے اصل حقیقت کیا ہے۔ تقویٰ کے خیال سے انہوں نے سب احادیث جلا دیں کہ یہ میرا سماع بلاواسطہ نہیں ہے۔ تذکرۃ الحفاظ کے الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ احادیث آپ نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنی تھیں اس لئے احتیاطاً تلف کردیں۔

حضرت ابوبکر کا منشاء یہ ہرگز نہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے حجت نہ پکڑو۔ یا ان سے راہنمائی نہ حاصل کرو۔ آپ کا عمل یہی تھا کہ قرآن کے بعد ہمارے امور کا فیصلہ سنت اور حدیث سے ہی ہوسکتا ہے۔

امام حاکم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کتابت حدیث کے جواز کے قائل تھے۔ جب ہی تو انہوں نے پانچ سو حدیثیں دوسرے صحابہ سے نقل کرکے یا لکھوا کر اپنے پاس رکھی تھیں اور ایک عرصہ تک یہ روایات ان کے پاس محفوظ رہیں۔ بعد میں انہوں نے اس مجموعہ کو نذر آتش کردیا۔

اس واقعہ کو پیش نظر رکھ کر ہرگز یہ گمان نہیں کرنا چاہیئے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حدیث اور کتابت حدیث کے مخالف تھے۔ پانچ سو روایات کا جمع کرنا سنت کی حجت کی بناء پر تھا اور پھر ان کی نقل میں شک ہو جانے کے باعث نذر آتش کرنا دوسری علت کی بناء پر تھا۔ حدیث یا کتابت حدیث کی مخالفت کی بناء پر نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر جس قدر جانثار اور شیفتہ حضرت ابوبکر صدیق تھے اس کی مثال پیش کرنا مشکل ہے۔ آپ کو قضا، فتاویٰ اور مقدمات کے متعلق قرآن مجید میں اگر حکم نہ ملتا تو صحابہ کرام سے حدیث دریافت کرکے اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ سابقین اولین میں سے تھے۔ بلکہ ایمان لانے والے مردوں میں سے پہلے شخص تھے اور سفر وحضر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں رہے تھے۔ ان سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو جاننے والا کون ہوسکتا تھا۔ مگر وہ بہ نظر احتیاط حدیث کی روایت بہت کم کرتے تھے اور ایک لفظ وحرف کے فرق کو بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ پھر بھی ان سے مروی احادیث کی تعداد ۱۴۲ کے لگ بھگ ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب حضرت ابوبکر سقیفہ بنی ساعدہ کے جلسہ عام میں تمام مسلمانوں کے اتفاق رائے سے خلیفہ منتخب کئے گئے تو آپ نے زمام خلافت ہاتھ میں لینے کے ساتھ ہی ملک کے حالات پر گہری نظر ڈالی اور حضرت اسامہ بن زید کو طلب کیا جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اسلامی لشکر کا سردار بنا کر علم دیا تھا اور وہ اہل روم کا مقابلہ کرنے کے لئے روانہ ہونے والے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت ناساز ہوگئی اور چند روز کی علالت کے بعد اپنے پروردگار سے جا ملے۔ جس کی وجہ سے حضرت اسامہ کی روانگی ملتوی ہوگئی تھی۔

حضرت ابوبکر نے حضرت اسامہ کو دوبارہ سالارِ لشکر بنایا اور علم عطا کیا اور فرمایا ''جس جھنڈے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھا ہے اس کو کھولنے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔''

ثابت ہوا حضرت ابوبکر سنت کو حجت مانتے تھے۔ آپ کی زندگی کے تین مشہور واقعات اس امر کی روشن دلیل ہیں

ثقیفہ بنی ساعدہ میں جب خلافت کے بارے میں تنازعہ چل نکلا تھا تو آپ نے مشہور حدیث "الائمہ من قریش" سے ہی استدلال فرمایا تھا۔ جسے موجود حاضر صحابہ کرام نے تسلیم کیا۔ پس امت کا سب سے پہلا تنازعہ بھی حدیث سے ہی حل ہوا۔ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن کا معاملہ بھی آپ نے قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے طے کیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ''جہاں میں فوت ہوں وہیں دفن کیا جاؤں'' لہٰذا حجرہ عائشہ میں آپ کا مدفن بنا۔

اور تیسرا اہم معاملہ وراثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ نے حدیث سے ہی طے کیا۔

لانورث ماترکنا فھو صدقه

ان تاریخی واقعات سے اظہر من الشمس ہے کہ حضرت ابوبکر اسلام اور بانی اسلام کے منشاء کو سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے۔ حدیث رسول سے استنباط کرتے اور اسے حجت مانتے تھے اور حدیث کی روشنی میں امت کے فیصلہ فرمائے پھر مستند تاریخ دین سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت عمال کو بھجوائیں کیا یہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھیں؟ پھر ان کو کیوں حرزِ جان بنایا اور نہ جلایا؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمانا کہ "حسبنا کتاب الله" سے ثابت ہوا کہ حدیث حجت نہیں

مرض الموت کی حالت میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لکھوانے کے لئے قلم دوات طلب کی تھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:۔

"حسبنا کتاب الله" یعنی ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔ اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ مقصد نہ تھا کہ آپ حدیث کے منکر تھے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت شدید مرض میں مبتلا تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ اس موقع پر دوات قلم (حسب ارشاد) لائے گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید زحمت و مشقت برداشت کرنی پڑے گی۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے از راہِ محبت اس حکم کی تعمیل ملتوی کرنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔ یعنی دین کے تمام اصول کلیات تو قرآن میں موجود ہیں۔ اگر کوئی جزوی ضرورت پیش آ ہی گئی تو قرآن کی طرف رجوع کر سکتے ہیں اور اس سے استنباط ہو سکتا ہے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کربناک حالت میں مزید تکلیف دینے سے کیا فائدہ۔

واضح رہے کہ اجتہاد اور استنباط کی دو شکلیں ہیں۔ ا۔ نئے حوادث اور نئی ضروریات کے لئے اگر قرآن و حدیث سے کوئی متعین تفصیلی شکل نہ مل سکے تو پھر قرآن کے پیش کردہ اصول و کلیات کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد و استنباط کی راہ اختیار کی جائے اور اس بارے میں سنت سے بھی مدد لی جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی کے تمام واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مسلک پہلا تھا نہ کہ دوسرا۔

منکرین حدیث نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے محتاط رویے کو اس طرح مبالغہ آرائی بلکہ غلط بیانی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ایک بے خبر شخص دھوکا کھا سکتا ہے لیکن اگر مندرجہ ذیل ارشادات پر سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مسلک پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجائے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:-

سیاتی قوم یجادلونکم بشبهات القرآن فخذوهم بالسنن فان اصحاب السنن اعلم بکتاب الله۔ (۱)

''عنقریب ایک قوم آئے گی جو قرآن میں شبہات پیدا کر کے تم سے بحث و مناظرہ کرے گی۔ ایسے لوگوں پر احادیث کے ذریعہ گرفت کرو۔ اس لئے کہ سنت کی معرفت رکھنے والے اللہ کی کتاب سے زیادہ باخبر ہیں۔''

ان عمر بن الخطاب کان یقول اصحاب الرای اعداء السنن اعتیهم الاحادیث انط واستحیوا حین سئلوا ان یقولوا لانعلم فعار ضوا السنن برائیهم فایاکم وایاهم۔ (۲)

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے رائے اور قیاس والے سنت کے دشمن ہیں۔ احادیث کا یاد رکھنا ان کو دشوار ہو گیا ہے اور جب ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا ہے تو انہیں لانعلم (ہم نہیں جانتے) کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہ لوگ اپنی ذاتی آراء (دماغی اختراعات) سنت کے مقابلہ میں لے آئے، ان سے دور رہو۔''

قال عمر رضی الله عنه ردو الجهالات الی السنة۔ (۳)

''جن باتوں کا علم نہ ہو ان کو سنت کی طرف لوٹاؤ۔''

قال عمر رضی الله عنه تعلموا الفرائض والسنة کما تتعلمون القرآن۔ (۴)

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا فرائض (احکامِ وراثت) اور سنت اس طرح سیکھو جس طرح قرآن مجید سیکھتے ہو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ مقتول شوہر کی دیت سے اس کی بیوی حصہ پائے گی یا نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ اس موقع پر ضحاک رضی اللہ عنہ بن سفیان حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے

۱- عظمت حدیث از مولانا عبدالغفار حسن رحمانی ص ۲۸۵ بحوالہ مقدمۃ المیزان للشعرانی

۲- اعلام الموقعین ج ۱ ص ۵۴

۳- جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۸۷

۴- ایضاً ص ۱۲۳

دیت سے حصہ لینے کا حق دار ٹھہرایا تھا۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے فیصلے سے رجوع فرمایا اور اس حدیث کے مطابق فیصلہ دیا۔ (۱)

احادیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین سو سال بعد امام بخاری و دیگر آئمہ نے جمع کی ہیں اس لئے ناقابل اعتماد ہیں

اس سے زیادہ اسلاف پر بداعتقادی اور اسلام سے دشمنی اور کیا ہوسکتی ہے۔ وہ امام اور محدثین کہ جن میں سے صرف ایک کو اگر ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں تمام منکرین حدیث کو بمع چکڑالوی کے تب بھی اُس اکیلے کا پلڑا بھاری ہوگا۔ اُن کے متعلق یہ گمان صرف ان کے ہی نہیں پوری امت کے متعلق بدگمانی ہے کہ انہوں نے جو اقوال پیش کئے وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال نہ تھے لیکن وہ یہی کہتے چلے گئے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یوں گویا ہوئے۔ ان کو تو یہ تمام اقوال رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہی نظر آتے ہیں لیکن تیرہ سو سال بعد آنے والے عبداللہ چکڑالوی اہل قرآن کے نزدیک یہ تمام شہادتیں ناقابل قبول تھیں۔ اور تمام گواہ پایہ ثقاہت سے گرے ہوئے ہیں۔ دنیا اصولی شہادت مانتی ہے تو مانا کرے وہ شاہدوں کی بناء پر فیصلے کرتی ہے تو کیا کرے۔ عبداللہ چکڑالوی صاحب نہ اس اصول کو مانتے ہیں نہ شاہدوں کو راست باز سمجھتے ہیں۔ افسوس صد افسوس! اپنے اسلاف کے متعلق یہ بدظنی اسلام کی ہمدردی ہے یا اس سے دشمنی؟

اہل اسلام سے یہ امر مخفی نہیں کہ ہر کام کے واسطے ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بھی اس میں مصلحت تھی اور امت کی بہتری۔ اگر خلفاء راشدین کے زمانے میں یہ ذخیرہ مدوّن ہو جاتا تو جو تحقیق اور اس فن کی باریکیاں معرض وجود میں آئیں کبھی بھی منصۂ شہود پر نہ آتیں۔

یہ حقیقت ہے کہ صحابہ کے دور میں بھی کچھ نہ کچھ احادیث کا تحریری ذخیرہ موجود تھا اور جب صحابہ کا دور گزر گیا تو بعض تبع تابعین کی طبیعت کو خدا نے اس طرف پھیر دیا کہ حدیثوں کو بھی جمع کر لینا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ حدیثوں کو جمع کرنے والے بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ جہاں تک ان کی طاقت میں تھا، حدیثوں کی تنقید کی اور ایسی حدیثوں سے بچنا چاہا جو اُن کی رائے میں موضوعات میں سے تھیں اور کسی مشتبہ الحال راوی کی حدیث نہیں لی۔

پہلے رسولوں کے حالات اور ارشادات اس لئے محفوظ نہ رہے تھے کہ وہ مختص الزمان تھے۔ زندگی کے ہر دور میں وہ نمونہ نہ تھے اور چونکہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ قیامت تک کا ہے اس لئے کامل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و ارشادات کا محفوظ ہونا منشاء خداوندی تھا۔ دوسری قومیں تو اس لئے روتی ہیں کہ اُن کے پیشوایان کے ارشادات کو

۱- سنن ابوداؤد کتاب الخراج باب فی المراۃ ترث من دیۃ

کیوں محفوظ کیئے گئے؟

بجائے اس کے کہ ہمارے سر اُن آئمہ کرام کے سامنے جھکے رہتے یہ ان آئمہ کا امت پر احسان ہے کہ انہوں نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو جمع کیا۔ کتنی احسان ناشناسی اور ناقدری ہے کہ اُن پر کیچڑ اچھالا جاتا ہے اور یہ سب کچھ خدمت اسلام کے نام پر ہو رہا ہے۔

اگر حدیث کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں جمع نہ ہونا دوسری یا تیسری صدی میں جمع ہونا عبداللہ چکڑالوی کے نزدیک حدیث کی بے اعتباری کا موجب ہے تو اس سے قرآن مجید کی صحت پر بھی حرف آتا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت خلیفہٗ اول پھر خلافت خلیفہٗ سوئم میں جمع ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں قرآن تحریری طور پر تو موجود تھا مگر مختلف چیزوں پر لکھا گیا تھا، کتابی شکل میں نہ تھا۔

حافظہ پر اس قدر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا جس قدر تحریر پر۔ یہ قول اس زمانہ کے لیے تو بے شک درست ہے لیکن ابتدائی زمانہ میں بالخصوص عرب کے حافظہ نے جو حیرت انگیز کارروائیاں دکھائی ہیں وہ آج کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتیں۔ اگر عرب میں حافظہ ایسا ہی ناقابل اعتبار ہوتا تو آج نہ عرب کی جاہلیت اور ابتدائی اسلامی زمانہ کے اشعار ہی ہم تک پہنچتے اور نہ ہی لغت اور نحو کے علوم کی اُن باریک باتوں تک ہم پہنچ سکتے جن سے آج ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ عربی اشعار اسی طرح کے سلسلہ رواۃ سے ہم تک پہنچے ہیں جس طرح احادیث۔ اور اصل بات یہ ہے کہ یہی ایک طریق اس زمانہ میں کسی علم کی حفاظت کا تھا۔ اشعار کے راوی نہ صرف کثرت سے شعر ہی زبانی سلسلہ روایت سے بیان کرسکتے تھے بلکہ وہ شاعروں کے نام اور ان کے حالات سے بھی خوب آگاہ تھے۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ شعر کا سلسلہ روایت یوں ہی کوئی لغو کام تھا۔ بلکہ لغت اور نحو کی بنیاد انہی اشعار پر ہے جو زبانی روایتوں سے پہنچے ہیں۔

ہر زمانے میں جب کبھی کسی لفظ کے معنوں میں یا کسی نحو کے قاعدہ میں تنازعہ پیدا ہوا تو شعر کی سند سے اس کا آخری فیصلہ ہوا اور کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ یہ شعر تو زبانی روایت سے مدت تک چلا آیا تھا اور بہت دیر بعد تحریر میں آیا ہے۔ اس کا اعتبار کچھ نہیں۔ پس تعجب ہے کہ جس صورت میں نازک ترین مسائل لغت یا نحو صرف زبانی یادداشتوں کی بنا پر حل کیے جاسکتے ہیں تو حدیث کے لیے اتنا شور کیوں مچایا جاتا ہے کہ زبانی روایتوں کے ہونے کی وجہ سے اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت عائشہ کو کئی ہزار اشعار جاہلیت کے یاد تھے تو کیا کئی سو احادیث وہ یاد نہ رکھ سکتی تھیں۔

ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ احادیث کا زبانی یاد رکھنا کوئی ایسا کام نہ تھا جس کے وہ لوگ عادی نہ ہوں بلکہ عربوں کے لیے یہ ایک معمولی سی بات تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب جمع قرآن کے لیے اولاً حضرت ابوبکر کو تحریک کی تو وجہ یہ بیان کی کہ بہت سے قرآن کے حافظ یمامہ کی لڑائی میں شہید ہوگئے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید کے لکھے ہوئے اجزا کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ تمام حافظوں کی وفات سے قرآن مجید کا کوئی حصہ مشتبہ ہو جائے۔ جس سے

شہید ہو کر سب کے سب دنیا سے اٹھ نہ جائیں۔ اس طرح حفاظت حدیث کا طریق حافظہ ہی قرار پایا جب تک کہ وہ وقت نہ آ گیا کہ حدیث کا علم کافی طور پر پھیل گیا اور اس قابل ہو گیا کہ اسے کتابوں میں جمع کیا جائے۔

بعض صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تحریری یادداشتیں حدیثوں کی لکھ لیا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد احادیث کو تحریر میں لانا اور بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ حضرت ابوبکر کے دورِ خلافت میں زکوٰۃ کے متعلق تمام احکام لکھے ہوئے تھے۔ جیسا کہ حضرت انس کی روایت میں پایا جاتا ہے کہ آپ انہی احکام کی نقل کر کے عاملوں کو بھیجا کرتے تھے۔ پس جب یہ کہا جاتا ہے کہ جمع حدیث کا کام ایک سو سال بعد شروع ہوا تو اس سے یہ مراد نہیں کہ اس سے پہلے حدیث کی حفاظت کا کوئی سامان نہ تھا اور نہ ہی اس سے یہ مطلب ہے کہ اس سے پہلے محدثین موجود نہ تھے اور نہ ہی اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس سے پہلے حدیث کا لکھا جانا ثابت نہیں بلکہ اس وقت جمع حدیث کا مطلب تدوین حدیث ہوتا ہے۔ یعنی احادیث کا کتابوں میں ابواب کی تقسیم اور ترتیب کے ساتھ لکھا جانا۔ سو انہی معنوں میں جمع حدیث کا کام پہلی صدی ہجری کے آخر یا اس کے بعد شروع ہوا اور اس کی تکمیل حضرت امام محمد بن اسمٰعیل بخاری نے کی۔ جمع حدیث کے ان دو مفہوموں کو عمداً یا غلطی سے گڑ بڑ کر دینے سے حدیث کی صداقت پر بہت سے اعتراض پیدا ہوئے کیونکہ ایک طرف تو کہہ دیا جاتا ہے کہ جمع حدیث کا کام پہلی صدی ہجری کے بعد شروع ہوا اور پھر اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ گویا اس سے پہلے حدیث کو نہ لوگ اکٹھا کیا کرتے تھے اور نہ اس کی تعلیم دی جاتی تھی اور نہ ہی اس کی حفاظت کا کوئی سامان تھا۔

پس سب سے اول یہ ضروری ہے کہ جمع حدیث کے بارے یہ مفہوم دل میں بٹھا لیا جائے کہ امام مالک کی مؤطا اور امام بخاری کی جامع صحیح بخاری سے پہلے بھی حدیث کو جمع کیا جاتا تھا اور اس کی حفاظت کے پورے پورے سامان موجود تھے اور حدیث کے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

معترضین کہتے ہیں کہ زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور زمانہ صحابہ کرام اور تابعین وغیرہ میں حدیث کا وجود ہی نہ تھا بلکہ امام بخاری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی سو سال بعد محض شنید پر بھروسہ کرتے ہوئے جامع صحیح بخاری تصنیف کی ہے۔

حفاظت حدیث

جو شخص کچھ بھی تاریخ اسلامی پر غور کرنے کی تکلیف گوارا کرے گا اسے معلوم ہوگا کہ شریعت اسلامی کی بنیاد ابتداء سے ہی اولاً قرآن مجید پر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل پر رکھی گئی۔ مثلاً قرآن مجید ابتداء میں ہی نماز کا حکم دیتا ہے لیکن کس طرح نماز پڑھنی ہے اس کے متعلق کوئی تفصیل قرآن مجید نے نہیں بتائی اور اگر بعد میں کبھی نماز کے بعض ارکان کا ذکر کر بھی دیا ہو تو کم از کم ابتداء میں نماز کے حکم کے ساتھ ہی کوئی تفصیل نہیں بتائی کہ نماز کس طرح پڑھنی چاہیے۔ پس نماز کے متعلق کل کے کل احکام اور اس کے پڑھنے کا طریق خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا اور یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم

قرآن مجید کے نزول کے ساتھ ہی پیدا ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک اخلاقی واعظ نہ تھے کہ کچھ مواعیظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے تو آپ نے لوگوں کو سنا چھوڑے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابتداء سے ہی ایک شارع تھے اور اپنی قوم کو ایک خاص راہ پر چلانے اور ان کے تعلقات باللہ اور تعلقات انسانی میں ان کو تعلیم دینا یہ شروع سے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ایک قول اور فعل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے ان کی زندگیوں کا سب سے قیمتی ذخیرہ تھا۔ خود قرآن مجید میں کس قدر پُر زور طریقے سے اور بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔

﴿قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله﴾ (آل عمران (۳):۳۰)۔

کہو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

﴿لقد کان لکم فی رسول الله اسوة حسنة﴾ (الاحزاب (۳۳):۲۱)۔

تمہارے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں عمدہ نمونہ ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس قدر قوی اور صریح ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا ہے کہ اس قدر متواتر احکام کی موجودگی میں کسی شخص کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے انکار کرنا خود قرآن مجید کا انکار ہے اور اہل قرآن کہلانے والے اس قدر صریح آیات قرآنی کا انکار کرتے ہوئے ہمیشہ اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں۔

حفاظت حدیث عہد نبوی میں

حفاظت حدیث کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تاکید کی۔ صحیح بخاری میں ابن عباس سے روایت ہے کہ جب قوم عبد القیس کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہمارے اور آپ کے درمیان کفار ہیں یعنی ہمارا راستہ ان کے درمیان میں سے ہے۔ پس ہم آپ کی خدمت میں سوائے حرمت والے مہینوں کے حاضر نہیں ہو سکتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز، روزہ اور زکوۃ وغیرہ کے احکام بیان فرمانے کے بعد ان سے فرمایا "احفظوه واخبروه من ورائكم" یعنی خود ان باتوں کو خوب محفوظ رکھو یعنی اچھی طرح سے یاد کر لو اور جو لوگ تمہارے پیچھے رہ گئے ہیں ان کو یہ باتیں صحیح صحیح پہنچا دو۔ (۱) یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود حدیث کی حفاظت کا اور اس کو صحیح صحیح دوسروں تک پہنچانے کا حکم دیتے ہیں۔

حفاظت حدیث کی شہادت کا اس سے بڑھ کر اور کیا واضح ثبوت ہو سکتا ہے؟ اس بات کی خبر بھی احادیث سے ہوتی ہے کہ جب کوئی نیا قبیلہ یا قوم ایمان لاتی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ میں سے ایک شخص کو ان کی طرف بھیج دیا کرتے تھے تاکہ وہ انہیں ان کے درمیان رہ کر احکام دین سکھا دے۔ اور پوری طرح سے دین اسلام اور اس کی شریعت سے باخبر کرے۔ ایسے لوگ ان نومسلموں کو نہ صرف قرآن مجید سکھانے کے لیے بھیجے جاتے تھے بلکہ اس غرض سے بھی کہ ان

۱- جامع صحیح البخاری۔ کتاب العلم۔ باب تحریص النبی وفد عبد القیس......

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال سے بھی اچھی طرح واقف ہوں تاکہ ان لوگوں کو جن کی طرف وہ بھیجے جاتے تھے احکام دین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل سکھا دیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ تاکیدی حکم تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو یاد رکھا جائے اور دوسروں کو صحیح پہنچایا جائے بلکہ مختلف اقوام میں جو وقتاً فوقتاً اسلام میں داخل ہوتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا واعظین کو بھیجنا (تاکہ وہ ان کو احکام دین سکھا دیں) اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں ہی اس پر عمل بھی کرا دیا۔ ان کو خود بھی یہ موقع ملتا تھا کہ براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تصدیق کر لیں۔ اس لیے ایسی احادیث ہر قسم کی غلطی اور آمیزش سے خالی تھیں۔ کیونکہ ایسے وقت میں جب چھوٹے چھوٹے معاملات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں وہ لوگ عرض کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک امام مقرر کیا تو اس کے متعلق یہ شکایت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئی کہ یہ قرأت لمبی پڑھتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ ان احادیث میں جو اسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ہی دوسروں تک پہنچنی شروع ہوگئی تھیں کسی قسم کا تصرف ہوا ہو۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود واعظین کو مختلف اقوام کے اندر بھیجنا کہ وہ ان کو دین حق سے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے آگاہ کریں، یہ حفاظت حدیث کے اقدامات میں سے پہلا قدم تھا۔

عن ابن مسعود قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول نضرالله امر اسمع منا شيئا فبلغه كما سمعه فرب مبلغ اوعى له من سامع۔

یعنی ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس آدمی کو سرسبز کرے جس نے ہم سے کوئی بات سنی پھر جس طرح اس کو سنا اس طرح اس کو دوسروں تک پہنچایا۔ کیونکہ بعض وہ لوگ جن کو باتیں پہنچائی جاتی ہیں اصل سننے والوں سے اس بات کو زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوتے ہیں۔

جامع صحیح بخاری میں روایت ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ پر سوار تھے اور ایک آدمی نے مہار پکڑی ہوئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا یہ کون سا دن ہے۔ ہم خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا کوئی جدید نام بتائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا یہ یوم النحر نہیں۔ یعنی ذوالحج کی دسویں تاریخ۔ ہم نے عرض کیا ہاں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا کہ یہ کون سا مہینہ ہے۔ ہم خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا کوئی اور نام بتائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا یہ ذوالحج کا مہینہ نہیں ہے۔ ہم نے عرض کیا ہاں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے خون اور تمہارا مال اور تمہاری عزت تمہارے درمیان ان سب کو وہی حرمت حاصل ہے جو تمہارے اس شہر میں اس مہینے کے اندر اس دن کو حاصل ہے۔ چاہیے کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو میری بات

آخری حصہ حدیث میں آنحضرت کی طرف سے یہ تاکید پائی جاتی ہے کہ آپ کی باتیں دوسروں کو پہنچائی جائیں اور اس بات کا ذکر کہ شاید وہ لوگ سننے والوں کی نسبت بات کو زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوں۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ ان غائبین کا جو صحابہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنیں پھر یہ فرض ہے کہ وہ ان کو یاد رکھ کر دوسروں کو وہی باتیں پہنچا دیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کا ماحصل یہ ہے کہ آپ کی باتیں یعنی حدیث نبوی ضائع نہ ہو بلکہ ایک دوسرے کو مسلمان اسے پہنچاتے رہیں۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ آنحضرت یہ چاہتے تھے اور صحابہ کو آپ نے یہ تاکید فرمائی کہ آپ کی حدیث بلا تغیر و تبدل دوسروں تک پہنچائی جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دینی مسائل کو سمجھانے اور یاد کرانے کے لیے دوہراتے تھے۔ بہت سی حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ بعض ضروری باتوں کو تین تین دفعہ دوہرایا کرتے تھے تاکہ سننے والے اچھی طرح آپ کی بات کو سمجھ جائیں۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ

عن عائشه قالت ما کان رسول الله یسرد سردکم هذا ولکنه کان یتکلم بکلا م بین فصل یحفظه من جلس الیه (۲)

یعنی رسول اللہ تمہاری طرح تڑ تڑ (لگاتار) باتیں نہیں کرتے تھے۔ آپ کی باتوں میں فاصلہ ہوتا تھا۔ یعنی ٹھہر ٹھہر کر کلام کرتے تھے۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ بات ذہن نشین کر لیتے تھے۔

اگر صحابہ کرام کو بات سمجھ نہ آتی تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار پوچھ لیتے تھے۔ ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ایک بات کو بار بار بیان کرنا تاکہ سننے والے اچھی طرح سمجھ لیں اور دوسری طرف صحابہ کا ایک بات کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنا جب پہلی دفعہ بیان کرنے سے سمجھ میں نہ آئے۔ یہ دونوں امور اس بات پر شاہد ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیث کی صحت اور اس کے سمجھانے میں اور صحابہ کرام اس کے محفوظ رکھنے اور سمجھنے میں پوری کوشش کرتے تھے۔

حدیث کی حفاظت کا ایک سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ وعید تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں جھوٹ بولنے والوں کے لیے فرمائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿لاتکذبوا علی فانه من کذب فلیلج النار﴾ (۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حدیث کے بارے میں مجھ پر جھوٹ مت باندھو۔ جس نے مجھ سے ایسی بات منسوب کی جو میں نے نہیں کہی تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں تلاش کرے۔

۱- جامع صحیح البخاری۔ کتاب العلم

۲- جامع ترمذی۔ باب کیف کان کلام رسول اللہ

۳- جامع صحیح البخاری۔ کتاب العلم۔ باب اثم من کذب علی النبی

اس بات سے ترساں رہتے تھے کہ کوئی غلط لفظ ان کے منہ سے نہ نکل جائے اور جب تک کسی حدیث کے متعلق انہیں یقین کامل نہ ہو جاتا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے تو وہ اسے بیان کرنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ جامع صحیح بخاری میں حضرت انس سے روایت ہے کہ حضرت انس نے لوگوں سے فرمایا کہ بہت سی حدیثیں بیان کرنے سے مجھے یہ بات روکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے گا وہ آگ میں جائے گا۔(۱)

عبداللہ بن زبیر نے اپنے والد زبیر سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے میں آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح حدیثیں بیان کرتا ہوا نہیں سنتا جس طرح فلاں اور فلاں آدمی بیان کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا رہتا تھا لیکن میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص مجھ پر جھوٹ بولے گا وہ آگ میں داخل ہوگا۔''

حضرت زبیر کا اس سے یہ مطلب نہیں تھا کہ دوسرے لوگ جو حدیثیں بیان کرتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں بلکہ انہوں نے فرمایا کہ چونکہ جھوٹ کے متعلق سخت ممانعت ہے اور وعید عذاب ہے اس لیے میں زیادہ حدیثیں بیان نہیں کرسکتا کیونکہ ان کے متعلق مجھے یقین کامل نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا۔ کذب کے معنوں میں یہی نہیں کہ کوئی شخص ایک خبر یا واقعہ کو غلط جان کر بیان کرے بلکہ کذب بمعنی خطا بھی آتا ہے۔ یعنی کسی شخص نے غلط واقعہ بیان کیا حالانکہ وہ خود اسے غلط نہیں سمجھتا۔

پس ڈر اس بات کا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ غلطی سے کوئی غلط لفظ یا قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو جائے۔ صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات بیان کرنے میں انتہا درجہ کے محتاط تھے۔ اس سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بات کا پورا پورا اہتمام کیا کہ احادیث پہنچانے میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو۔

اسی طرح حدیث کی حفاظت کا سلسلہ جاری رہا۔ اور حفاظت حدیث کا یہ سلسلہ ایک زنجیر کی طرح ہے جس کی کڑیاں آپس میں ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز جو پہلی صدی کے آخر میں خلیفہ ہوئے انہوں نے حفاظت حدیث کے لیے اقدامات کیے۔ جامع صحیح بخاری میں روایت ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن حزم کو لکھا (ابوبکر بن حزم آپ کے ماتحت حاکم مدینہ تھے اور خود تابعی تھے) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو احادیث ملے اسے نگاہ میں رکھو اور اسے لکھ لو۔ میں ڈرتا ہوں کہ علم (یعنی علم حدیث) گم نہ ہو جائے۔ اور سب علماء اٹھ نہ جائیں اور حدیث نبوی کے سوا اور کچھ قبول نہ کرو۔ اور چاہیے کہ علم کو پھیلایا جائے اور علمی مجالس ہوا کریں۔ تاکہ جو لوگ (حدیث سے) ناواقف ہیں ان کو تعلیم دی جائے کیونکہ علم نابود نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مخفی نہ ہو جائے۔'' (۲)

۱- جامع صحیح البخاری۔ کتاب العلم۔ باب اثم من کذب علی النبی

۲- ایضاً

عبدالعزیز نے بھیجا تھا۔خواہ یہ حکم ایک حاکم کے نام بھیجا ہو یا سب کے، استدلال اس سے یہ کیا کہ اس وقت تک جب خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے یہ حکم لکھا جو تاریخی طور پر ثابت ہے مسلمانوں کے درمیان وضعی احادیث پیدا نہ ہوئی تھیں اور یہ بات اس حکم کے الفاظ پر غور کرنے سے ثابت ہوتی ہے۔ امیر المؤمنین نے جس بات کا اندیشہ ظاہر کیا ہے وہ یہ ہے کہ علماء فوت ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ علم حدیث گم ہو جائے۔ اس لیے تمام حدیثیں جو تمہیں ملیں لکھ لو اور وضعی احادیث کا نام تک بھی نہیں لیا۔ اگر وضعی احادیث اس وقت پیدا ہوگئی تھیں تو بڑا خطرہ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا کہ علماء فوت ہو جائیں گے تو علم حدیث گم ہو جائے گا بلکہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ وضعی احادیث بکثرت مروج ہوگئی ہیں اور صحیح احادیث کو ان سے الگ کرنا ضروری ہے۔

یہ حکم بھی دیا کہ علمی تذکرے بڑھائے جائیں اور علمی مجالس منعقد کی جائیں تاکہ ناواقف لوگ بھی احادیث سے واقف ہو جائیں اور یہ جو کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے سوا اور کچھ نہ قبول کیا جائے، اس کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ کسی صحابی کا قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے غلط نہ کر دیا جائے۔ بہر حال وضعی احادیث کا اس تحریر میں ذکر تک نہیں چہ جائیکہ ان کی کثرت یا ان کے مروج ہونے کا ذکر ہو۔

صحابہ حدیث کی صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ کسی حدیث کو قبول کرنے یا آگے بیان کرنے مین بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ بلکہ ایک ایک حدیث کے متعلق علم صحیح حاصل کرنے کی خاطر سینکڑوں میلوں کے سفر اختیار کرتے اور ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کرتے تھے۔ جابر بن عبداللہ جنہوں نے ایک حدیث کی خاطر مدینہ سے شام کا سفر کیا۔

(رحل جابر بن عبدالله میسرة شهر الی عبدالله بن انیس فی حدیث واحدٍ) (۱)

یعنی جابر بن عبداللہ نے ایک مہینہ کا سفر عبداللہ بن انیس کی طرف صرف ایک حدیث کی خاطر کیا۔

یہ تھا صحابہ کرام کا حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جوش اور عشق۔ حدیث کی تلاش میں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے جو سفر کی صعوبتیں تھیں وہ ان کی نظر میں ایک حدیث کے سننے کے بالمقابل ہیچ تھیں۔ یہی حال تابعین کا تھا۔ انہوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کے منہ سے حدیث کو سننے کے لیے لمبے لمبے سفر کیے۔ اس قسم کے کئی واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔

پہلی صدی ہجری کے اختتام تک کل صحابہ اس دنیا سے گزر چکے تھے۔ حدیث کی درس گاہیں صحابہ کرام کے زمانہ میں ہی قائم ہو چکی تھیں۔ اب حدیث کے لیے اس طرح پر تلاش کی ضرورت نہ رہ گئی تھی جیسے صحابہ کرام کے وقت میں تھی۔ کیونکہ صحابہ کرام کے زمانہ تک نئی نئی احادیث اشاعت پاتی رہتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سوائے چند صحابہ کرام کے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی جمع حدیث کا کام کرتے تھے ہزارہا اور صحابہ کرام بھی تھے اور ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو کوئی نہ کوئی ایسی حدیث یاد رکھتے تھے جو عام طور پر شہرت یافتہ نہیں تھی۔ پس جمع حدیث کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان

۱۔ جامع صحیح البخاری۔ کتاب العلم۔ باب الخروج فی طلب العلم

بہت سی حدیثوں کی اشاعت کا موجب ہوگئیں۔ کیونکہ جب کبھی کوئی مقدمہ یا تنازعہ یا کوئی امر فیصلہ طلب پیش ہوتا تو قرآن مجید کے بعد سب سے پہلے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہی صحابہ کرام رجوع کرتے تھے اور جہاں امر پیش آمدہ پر کوئی حدیث پوری پوری منطبق نہ ہوتی تو اس کے قریب قریب کوئی حدیث تلاش کی جاتی اور اس پر قیاس کرکے امر پیش آمدہ کا فیصلہ کیا جاتا۔ ان احادیث کی اچھی طرح پڑتال بھی کی جاتی تھی۔

دوسری صدی ہجری کے شروع میں حدیث کی تلاش عموماً ان درسگاہوں تک محدود ہوگئی تھی جہاں علم حدیث کا چرچا ہوتا تھا اور بہت کم حدیثیں تھیں جو ان درس گاہوں میں نہ آگئی ہوں۔ ان درس گاہوں کے قائم ہونے اور ان میں علم حدیث پڑھانے سے جمع حدیث کی ایک گونہ تکمیل ہو چکی تھی۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ اس ایک درس گاہ میں کل احادیث مل سکتی تھیں۔ بلکہ جو احادیث کسی محدث یا تابعی نے کسی صحابی سے سن کر حفظ کر لی تھیں انہی احادیث کی اشاعت اس درس گاہ میں ہوتی تھی اور پھر سفر کے ذریعہ محدثین کے علم میں وسعت ہوتی رہتی تھی۔ علاوہ ازیں اس زمانہ میں حدیث کا لکھنا پہلے کی نسبت زیادہ مروج ہو گیا تھا اور جہاں محدثین درس گاہوں میں حدیث کا درس دیتے تھے بہت سے لوگ ان کو لکھ لیا کرتے تھے اور جو حافظہ پر پورا بھروسہ کرسکتے تھے وہ وہیں یاد کرلیا کرتے تھے۔

دوسری صدی ہجری کے نصف کے قریب حدیث کے لکھے جانے نے ایک اور رنگ پکڑ لیا اور بجائے متفرق مسودات کے مستقل کتابیں حدیث پر لکھی جانے لگیں۔ اس زمانے تک محض تحریری مسودہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی نہ تھا کہ واقعی یہ ایک حدیث صحیح اور قابل اعتبار ہے بلکہ یہ ضروری تھا کہ معتبر سلسلہ رواۃ سے حدیث کو کسی مشہور صحابی تک پہنچایا جائے اور ان تمام راویوں کے نام درجہ بدرجہ ظاہر کیے جائیں جن کے ذریعہ حدیث اس بیان کرنے والے تک پہنچی تھی۔ اس لیے ان کتابوں میں پورا پورا سلسلہ راویوں کا دیا جاتا تھا۔ یہ کتابیں اشاعت کے بعد یہ وقعت رکھتی تھیں کہ ان کی احادیث کا حوالہ دیا جائے۔ سب سے پہلے جن ہستیوں کو یہ شرف حاصل ہوا ان میں امام عبدالملک بن عبدالعزیز، ابن جریج ربیع بن صبیح اور سعید ابن عروبہ تھے۔ ان کے بعد حدیث کے بڑے معتبر امام حضرت مالک بن انس تھے۔ جن کی کتاب مؤطا آج تک حدیث میں سند مانی جاتی ہے۔ یہ کتاب اہل حجاز کی احادث پر مبنی تھی۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال وفتاویٰ بھی درج تھے۔

مختلف مقامات میں مختلف ائمہ حدیث نے اس زمانہ میں کتابیں لکھیں۔ چنانچہ ابن جریج نے مکہ میں، امام مالک نے مدینہ میں، سفیان بن عینیہ نے بھی مدینہ میں، عبداللہ بن ویب نے مصر میں، عبدالرزاق نے یمن میں، سفیان ثوری اور محمد بن فضیل نے کوفہ میں، حماد بن سلمہ اور روح بن عبادہ نے بصرہ میں، ہیثم نے واسط میں اور عبداللہ بن مبارک نے خراسان میں کتابیں تصنیف کیں۔ اصل میں تدوین حدیث کا کام شروع ہو گیا تھا مگر ابھی تک یہ کام تکمیل کو نہ پہنچا تھا۔ اس مرحلہ تک جو کتابیں لکھی گئی تھیں اول تو ان کے اغراض محدود تھے۔ یعنی ان میں ہر قسم کی احادیث نہ پائی جاتی تھیں۔ صرف خاص مقاصد کو مدنظر رکھ کر تالیفات کی گئی تھیں۔ اور دوسرا ان میں وہی احادیث ان مضامین کے متعلق جمع کی گئی تھیں جو اس

نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ۔

پس باوجود تدوین حدیث کے کام کے شروع ہونے کے جمع حدیث کا کام ابھی تکمیل کو نہ پہنچا تھا۔ یہ کمال کو اس وقت پہنچا جب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جمع حدیث کا کام شروع کیا اور اس کو ہر پہلو سے مکمل کر کے دکھایا۔ امام محمد بن اسماعیل جو بخاری کے نام سے مشہور ہیں کیونکہ بخارا ان کا اصل وطن تھا، تیسری صدی ہجری کی ابتداء میں انہوں نے یہ کام شروع کر دیا تھا اور کتاب جامع صحیح بخاری تالیف کی۔ ان کی وفات ۲۵۶ ہجری میں ہوئی۔ اس زمانہ میں ان کے شاگرد امام مسلم نے جمع حدیث کا کام شروع کیا اور جامع صحیح مسلم تالیف کی۔ جس کا مرتبہ صحیح بخاری سے دوسرے درجہ پر ہے۔ پھر امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام نسائی نے اس کام کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ ان تینوں کی کتابیں اگرچہ موطا، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے مرتبہ کو نہیں پہنچتیں مگر ان سے دوسرے درجہ پر معتبر کتابیں ہیں۔

ان کے مصنفوں نے ہر ایک جگہ خود سفر کر کے کل معتبر احادیث کو جمع کیا اور اپنی ساری ساری زندگیاں اسی کام کے لیے وقف کر دیں۔ یہ مرحلہ جمع حدیث کی تکمیل کا مرحلہ تھا اور معتبر احادیث کا ذخیرہ کتابوں کی صورت میں جمع ہو گیا تھا۔

اس طرح احادیث کی جمع کا کام مکمل ہوا لیکن صرف اس وجہ سے کہ اس کام کی تکمیل فی الفور نہیں ہوئی اور ایک عرصہ دراز اس پر لگا، حدیثوں پر بے اعتباری نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ تک ترقی ایک قدرتی عمل تھا جس کے سوا یہ کام احسن طور پر انجام نہ پا سکتا تھا اور یہ مرحلے آپس میں ایسے وابستہ ہیں جیسے زنجیر کی کڑیاں۔

قرآن کے مطابق جو احادیث ہیں صرف وہی صحیح احادیث ہیں

صحیح حدیث کی تعریف کرتے ہوئے چکڑالوی صاحب فرماتے ہیں

> ''حدیث صحیح سے مراد قول یا فعل یا تقریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مسئلہ قرآنیہ کے متعلق کیا یا کہا ہو۔ یا کسی کے کئے یا کہے کو ثابت رکھا ہو۔ اور یہ تمام قرآن شریف کے ترجمہ یا تشریح تک محدود ہو'' (۱)۔

مزید فرماتے ہیں:۔

> ''بلکہ صحت حدیث صحیح کی میزان صرف قرآن شریف ہی ہے اور بس۔ اور جو حدیث مطابق قرآن مجید ہو وہ صحیح ہے اور جو مطابق قرآن مجید کے نہ ہو وہ صحیح نہیں ہے۔ خواہ متواتر ہی کیوں نہ ہو'' (۲)

چکڑالوی صاحب نے صحیح حدیث کے لئے جو کسوٹی مقرر کی ہے وہ سراسر عقل کے خلاف ہے۔ اگر صحت حدیث کا مدار صرف مطابقت قرآن ہے تو پھر اگر کوئی شخص ایک مضمون قرآن مجید کے مطابق از خود بنا کر اس کو ناحق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دے اور یہ کہے کہ یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے تو کیا اس کو صحیح مان لیا جائے گا؟

۱- اشاعۃ السنۃ نمبر ۵ ج ۱۹ ص ۱۵۲

۲- اشاعۃ السنۃ نمبر ۵ ج ۱۹ ص ۱۵۳

جائے تو پھر موضوع کس کو قرار دیا جائے گا۔

بعض احادیث خلاف عقل ہیں

منکر حدیث کو جو احادیث خلاف عقل نظر آتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ:

عن ابی هریره عن نبی انه قال اذا اشتد الحرفابر دوا بالصلاۃ...... وهو اشدما تجدون من الذمهریر۔ (۱)

ترجمہ: ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب گرمی زوروں پر ہو تو نماز ٹھنڈی کر کے (ٹھنڈے وقت) میں پڑھو کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی پھونک سے ہے۔ جہنم نے اپنے رب سے شکایت کی اور کہا: اے رب! میرے ایک حصے نے دوسرے حصے کو کھالیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دے دی۔ ایک سانس کی جاڑے میں اور ایک سانس کی گرمی کے موسم میں اور وہ (گرمی کا سانس) اس سخت گرمی جیسا ہے جو تم محسوس کرتے ہو اور وہ سردی کا سانس اس سخت سردی جیسا ہے جو تم محسوس کرتے ہو۔

منکر حدیث کہتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گرمی کی شدت جہنم کی پھونک کی وجہ سے ہوتی ہے۔ تیز سردی و گرمی کے موسم جہنم کی دو پھونکوں کے سبب آتے ہیں۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ موسموں کا تغیر زمین کی مداری گردش اور سورج کے قرب و بعد کی بناء پر ہے۔

اس حدیث کے بارے میں بھی بنیادی بات یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود ایک عالم طبعیات کی حیثیت سے موسمی تغیرات کی وجوہ بیان فرمانا نہیں ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نبی کی حیثیت سے گرمی کی تکلیف محسوس کرنے والوں کو جہنم کا تصور دلانا چاہتے ہیں۔ دوپہر کے وقت صحرائے عرب کی گرمی کا جو حال ہوتا ہوگا آسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ایسی گرمی میں ظہر کی نماز کے لئے نکلنا واقعی بڑا شاق گزرتا ہوگا۔ چنانچہ مسند امام احمد میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ''ظہر کی نماز سے بڑھ کر کوئی نماز صحابہ کرام پر شاق نہ تھی۔'' اس پس منظر میں دیکھئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا اس سے آپ کا مقصود دوزخ سے ڈرانا اور ان کاموں سے روکنا تھا جو انسان کو دوزخ کی طرف لے جاتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد قرآن کریم کے اس ارشاد سے ملتا جلتا ہے جو غزوہ تبوک کے موقع پر ان لوگوں کے لئے جو گرمی سے گھبرا کر جہاد پر نکلنے سے جی چرا رہے تھے، فرمایا گیا تھا:

﴿قَالُوْا لَاتَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ، قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا۔﴾ (توبہ(۹):۸۱)۔

جس طرح قرآن دنیا کی گرمی کا جہنم کی گرمی سے مقابلہ اس لئے کر رہا ہے کہ پس منظر میں وہ لوگ ہیں جو گرمی سے گھبرا کر جہاد پر جانے سے ہچکچا رہے ہیں اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی دنیا کی شدید گرمی اور شدید سردی کو دوزخ

۱- جامع صحیح البخاری۔ کتاب مواقیت الصلاۃ ابراد بالظہر

نماز کے لئے گھروں سے نکلنا شاق سمجھ رہے ہیں (فان شدة الحر من فبح جهنم) کہنے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد لازماً یہی نہیں ہے کہ دنیا میں گرمی جہنم کی پھونک کی وجہ سے ہوتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ یہ دونوں موسم جہنم کی دو پھونکوں کے سبب سے آتے ہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو دو سانسوں کی اجازت دی۔ایک سانس سردی کے موسم میں ایک سانس گرمی کے موسم میں اور یہ جو تم گرمی سردی محسوس کرتے ہو اس کو دوزخ کی انہی دو سانسوں پر قیاس کرلو۔غرض جس شخص نے بھی قرآن اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ غور کیا ہوگا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سن کر بلا تامل کہہ اٹھے گا کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طبیعات کے کسی مسئلے کو نہیں بلکہ جہنم کی شدت گرمی کو ذہن نشین کرانا چاہا ہے۔

بعض احادیث آپس میں متعارض ہیں

منکرین سنت کی طرف سے ایک اعتراض یہ پیش کیا جاتا ہے کہ احادیث آپس میں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی اور ٹکراتی ہیں ایک حدیث میں کسی بات کا اثبات ہے تو دوسری جگہ اس کی نفی میں ہے۔

یہ شبہ دراصل اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ان لوگوں کو علم حدیث کی پوری تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔ یہ اختلاف بظاہر نظر آتا ہے۔معنوی اعتبار سے حدیث میں کوئی تضاد اور تناقض نہیں ہے۔ یہ تضاد اور اختلاف تقریباً مندرجہ ذیل آیات کے ظاہری اختلاف سے ملتا جلتا ہے۔مثلاً

ا۔سورہ انعام میں مشرکین کے بارے میں کہا گیا کہ ''قیامت کے دن اپنے مشرکانہ عقائد سے برأت کا اظہار کریں گے اور قسم کھا کر کہیں گے ﴿وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَاكُنَّا مُشْرِكِيْنَ۔﴾ (انعام(۶):۲۳)۔

لیکن دوسری آیت میں مشرکین کے بارے میں ارشاد ہے ﴿وَلَايَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا﴾ (نساء(۴)۴۲) وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپا نہ سکے۔

﴿وَلَايُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ﴾ (قصص (۲۸):۷۸) اور مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں پرسش نہ ہوگی۔دوسری جگہ ارشاد ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ O عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (حجر(۱۵) ۹۲،۹۳) تیرے رب کی قسم ہم ان سے پوچھیں گے ان اعمال کے بارے میں جو وہ کرتے رہے ہیں۔

﴿فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَايَتَسَآءَلُوْنَ﴾ (المومنون(۲۳):۱۰۱)۔

یعنی اس دن وہ آپس میں ایک دوسرے سے سوال نہ کریں گے۔اور ﴿وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ﴾ (الصٰفٰت (۳۷)۲۷) اور ایک دوسرے پر سوال کرتے ہوئے متوجہ ہوں گے۔

امام بخاری نے اپنی جامع صحیح میں اسی نوع کی آیات جمع کر کے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ تطبیق اور رفع تعارض کی تفصیلات کو نقل کیا ہے۔

پہلے کوشش کی جائے گی کہ دو متعارض روایات کی ایسی تشریح بیان کی جائے کہ بغیر کسی تعلق کے دونوں روایات کا تعارض رفع ہو جائے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر غور کیا جائے گا ان دونوں میں سے ناسخ روایت کون سی ہے اور منسوخ کون سی۔

اگر ناسخ منسوخ کا پتہ بھی نہ چل سکے، تو پھر اس روایت کو ترجیح دی جائے گی جو راویوں کی کثرت یا ان کی عدالت و ثقاہت کے لحاظ سے نمایاں مقام رکھتی ہوگی۔ محدثین نے ترجیح کے سلسلے میں پچاس وجوہ لکھی ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ (۱)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو احکام دیتے تھے ان میں سے بعض احکام وقتی ہوتے تھے۔ پھر وہ وقت گزر جانے اور حالات کے مناسب ہونے پر ان کو منسوخ فرمادیتے یا کراہت کو اجازت میں بدل دیتے تھے۔ جیسا کہ ایک سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے گوشت کو تین دن سے زیادہ بطور ذخیرہ رکھنے سے منع فرمایا۔ دوسرے سال لوگوں نے جب اس ہدایت پر عمل کرنے کی بابت پوچھا تو آپ نے فرمایا میں نے قربانی کے دن مساکین کی کثرت دیکھ کر تمہیں گوشت بچانے سے روک دیا تھا۔ اب تمہیں اجازت ہے تم قربانی کا گوشت کھاؤ، خیرات کرو اور بچاؤ۔

یہ اعتراض دراصل معترضین کی کم علمی اور کج فہمی پر دلالت کرتا ہے۔ منکر حدیث کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ کتب حدیث کا تقابلی مطالعہ انہیں حاصل نہیں۔ وہ احادیث کے بارے میں جو فیصلہ کرتے ہیں اپنے محدود مطالعہ کی بناء پر کرتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ کبھی نہ کہتا کہ اکثر احادیث باہم متعارض ہیں۔ جن لوگوں کی احادیث کے پورے ذخیرے پر نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ احادیث کے درمیان اتفاق بہت زیادہ ہے اور اختلاف بہت کم ہے۔ مثلاً احادیث صفات و فضائل میں کوئی تعارض نہیں احادیث اخلاق و رقاق میں بھی کہیں تعارض نظر نہیں آتا۔ اس طرح احادیث معجزات تعارض سے پاک ہیں۔ نیز احوال جنت اور جہنم کے متعلق جو احادیث وارد ہیں ان میں بھی ننانوے فیصد احادیث ایسی ہیں جن میں کوئی تعارض نہیں پایا جاتا ہے۔ لے دے کہ وہ احادیث رہ جاتی ہیں جو یا تو بعض واقعات پر مشتمل ہیں اور یا پھر ان کا تعلق احکام سے ہے۔ جہاں تک احادیث واقعات کا تعلق ہے تو ان میں اگر چہ بہت قلیل تعداد ایسی حدیثوں کی ضرور ملتی ہے جو باہم متعارض تو نہیں البتہ باہم مختلف دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ان کا باہمی تعارض واختلاف ظاہری نظر سے ہی محسوس ہوتا ہے غور وفکر کے بعد اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے تقابلی مطالعہ کے بعد اکثر و بیشتر رفع ہو جاتا ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ یا تو مختلف راویوں نے ایک ہی بات یا واقعہ کو مختلف الفاظ میں بیان کیا ہوتا ہے جو بظاہر باہم متعارض وہ مختلف نظر آنے لگتے ہیں حالانکہ معانی ومفہوم کے لحاظ سے ان کے درمیان کوئی تعارض واختلاف نہیں ہوتا۔ یا پھر مختلف راویوں نے ایک ہی واقعہ کے مختلف اجزاء بیان کیے ہوتے ہیں۔ ناواقف سمجھتا ہے کہ ان کے بیانوں میں اختلاف ہے۔ جبکہ احادیث کے ذخیرے سے واقف اس واقعہ کے تمام اجزاء کو یکجا کر کے ان کے باہمی تطابق کو پالیتا ہے۔ یہی حال احادیث احکام کا ہے۔ جو احادیث باہم متعارض نظر آتی ہیں وہ اس قدر کم ہیں کہ غیر متعارض احادیث کی نسبت وہ شاید ایک فیصد بھی نہیں۔

۱- عظمت حدیث از عبدالغفار حسن ص ۱۸۷ بحوالہ مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۴۳

احادیث کے ساتھ ایک صورت حال یہ ہے کہ احادیث میں باہم تقدم و تاخر زمانی موجود ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو علوم حدیث پر عبور حاصل ہوتا ہے وہ اس تقدم و تاخر زمانی کو معلوم کر لیتے ہیں اور اس کی بنیاد پر پہلی حدیث کو منسوخ اور بعد والی کو ناسخ قرار دیتے ہیں۔ احادیث و احکام کا مطالعہ کرتے وقت یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ بہت سے اعمال و افعال کی تشریح دفعتاً نہیں ہوتی بلکہ بتدریج ہوتی ہے۔ مثلاً نماز ابتداء میں دو رکعت فرض ہوئی بعد میں رکعات کی تعداد چار ہو گئی یا مثلاً ابتداء اسلام میں صرف دو ہی وقت صبح اور عصر کی نماز فرض تھی بعد میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں تو احکام پر مشتمل احادیث کے معاملے میں اس تدریج کے عمل کا لحاظ رکھنا بھی بہت ضروری ہے اس تدریج کے عمل سے پیدا ہونے والے اختلاف کو تعارض یا تناقص کا درجہ دینا غلط ہوگا۔ غرض ایسی احادیث جن کا باہمی تعارض کا رفع کرنا مشکل ہے ان کی نسبت ایسی ہی ہے جو ایک کے عدد کو ہزار کے عدد سے ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قدر اقل و قلیل احادیث متعارضہ کی بنیاد پر پورے ذخیرہ حدیث کو غیر معتبر قرار دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ احادیث نبویہ کسی ایک ناقابل تقسیم کل کا نام تو ہے نہیں کہ اس کا ایک جز ساقط ہوا تو کل کے کل کا ساقط ہونا لازم ہو گیا۔ ہر حدیث اپنے اپنے مقام پر اپنی ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے اور ہر ایک اپنی جداگانہ سند کے ساتھ روایت ہوتی ہے۔ چند متعارض روایات کی بناء پر ہزاروں روایات کا سقوط لازم نہیں ہو سکتا۔

اگر ترک ہی کرنا ہو تو ظاہر ہے صرف انہی روایات کو ترک کیا جائے گا جو باہم متعارض ہوں گی۔ ان کی وجہ سے غیر متعارض روایات کو ترک کرنے والا نامعقول ہی کہلائے گا۔ پھر کیا یہ مناسب نہیں کہ دو حدیثوں میں تضاد دیکھتے ہیں تو ایک سچے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اسے حل کرنے کی کوشش کریں یا یہ مناسب ہے کہ دنیا میں اس تضاد کا ڈھنڈورا پیٹا جائے۔ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول نہ تو خدا کے قول قرآن کے خلاف ہو سکتا ہے اور نہ اقوال رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہی باہمی تضاد ہو سکتا ہے۔ اگر طبیعت میں ایمانداری ہو اور طبیعت بہانہ جو نہ ہو تو ظاہری تضاد حل ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے غور و فکر مطالعہ اور خدا تعالیٰ سے استمداد کی ضرورت ہے۔

چھوٹی چھوٹی باتوں میں اختلاف ہے جیسے ہاتھ سینے کے اوپر باندھے جائیں یا نیچے، رفع یدین کیا جائے یا نہیں، آمین بلند آواز سے کہی جائے یا ہلکی آواز سے۔ ان میں اختلاف ہونا ایک معمولی بات ہے اور اس کی اصل وجہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان معاملات میں وسعت رکھی ہے۔ کبھی ایک طرح عمل کر لیا ہے کبھی دوسری طرح۔ لیکن جس طرح تمام مسلمانوں کے پاس ایک ہی قرآن ہے، تمام مسجدیں جہاں کہیں ہوں ایک ہی رخ یعنی قبلہ رخ بنی ہوئی ہیں اسی طرح نماز بھی تمام مسلمانوں کی ایک ہے۔ اس کے وہی اوقات ہیں، وہی رکعات ہیں، وہی ارکان ہیں، یہی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ ایسا عظیم الشان تاریخی ثبوت ہے کہ جو شخص اس کو رد کرتا ہے وہ دنیا کے کسی تاریخی امر کو قبول نہیں کر سکتا۔

جب ہم اختلافات پر غور کرتے ہیں تو ان میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس سے حدیث کی صحت پر شبہ وارد ہو سکے۔ بلکہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اختلافات کا ہونا حدیث کی صحت پہ ہی شہادت ہے۔ مثلاً اول تو فروع میں

یہی ہوسکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے افعال کو کئی طرح کر کے دکھایا یا بعض امور میں خود ہی رخصت دی۔ اس کی شہادت کثرت سے احادیث میں ملتی ہے۔

بعض احادیث نامناسب مضامین پر مشتمل ہیں

منکر حدیث کا ایک اعتراض ان احادیث کے بارے میں ہے جو بقول ان کے نامناسب مضامین پر مشتمل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بعض احادیث تو ایسے مضامین پر مشتمل ہیں جو اخلاقی لحاظ سے معیوب خیال کئے جاتے ہیں۔ جبکہ بعض احادیث ایسی ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہرات کے درمیان خالصتاً ازدواجی تعلقات کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی اکثر و بیشتر خود ازواج مطہرات کی زبانی۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ازواج مطہرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایسے معاملات بھی لوگوں کو بتا دیں اور بتانے میں کوئی شرم محسوس نہ کریں جن کو عام طور پر میاں بیوی کے سوا دوسرا کوئی نہیں جانتا اور نہ کسی دوسرے کو اس پر مطلع کرنا کوئی گوارہ کرتا ہے۔

منکر حدیث کا یہ اعتراض ان کی کج فہمی اور ہٹ دھرمی پر مبنی ہے۔

اس قسم کی احادیث دراصل ان مسائل پر مشتمل ہیں جو انسانی زندگی کے مخفی شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا انسان کے علم میں آنا اس کی اپنی صحیح تعلیم و تربیت کے لئے از بس ضروری ہے۔

وہ احادیث جن پر اعتراض کیا ہے ان احادیث میں جو مضمون حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی بیان ہوا ہے۔ اس کی اصل حقیقت سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر جاننا ضروری ہے جو ان احادیث کو روایت کرتے وقت پیش نظر تھا۔ دراصل جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کے ناپاک ہونے کا تصور شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح قدیم شریعتوں میں بھی تھا۔ لیکن قدیم شریعتوں میں اس قدر بڑھا دیا تھا کہ وہ جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کے وجود ہی کو ناپاک خیال کرنے لگے تھے۔ ان کے زیر اثر اہل حجاز میں بھی یہ تصور حد مبالغہ کو پہنچ گیا تھا۔ خصوصاً حائضہ عورت کے ساتھ رہنا سہنا بھی گناہ خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب عورت کو حیض آتا تھا تو یہودی اس کے ساتھ کھانا پینا اور اس کے ساتھ رہنا چھوڑ دیتے تھے۔ (۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اس حالت میں صرف مباشرت ناجائز ہے۔ اس کے علاوہ میل جول، رہن سہن، کھانا پینا غرض ہر قسم کی معاشرت حائضہ عورت کے ساتھ اسی طرح رہتی ہے جیسی اس کے پاک ہونے کی حالت میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگرچہ اس سلسلہ میں بنیادی غلط فہمی رفع ہوگئی تھی تاہم قدیم توہمات و تعصبات کے زیر اثر ایک عرصہ تک لوگ یہ سمجھتے رہے کہ جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کا وجود کچھ نہ کچھ گندا ہی رہتا ہے۔ اس لئے اس حالت میں اس کا ہاتھ جس چیز کو لگ جائے وہ بھی کم از کم مکروہ تو ضرور ہو جاتی ہوگی۔

۱۔ مشکوۃ المصابیح۔ کتاب الطہارۃ باب الحیض

احادیث وضعی ہیں

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ احادیث میں بعض وضعی احادیث بھی ہیں لیکن ان کی نشاندہی کردی گئی ہے۔ علم روایت اور علم درایت کے لئے مختلف معیار وضع کردیئے گئے ہیں جن پر ہم کسی بھی حدیث کو پرکھ کر صحت یا عدم صحت کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔ پس جب امتیاز کی کسوٹی موجود ہے تو پھر اگر موتیوں اور جواہرات میں چند سنگریزے بھی شامل ہو جائیں تو کیا ان موتیوں اور جواہرات کو اس لئے سمندر میں پھینک دیا جائے گا کہ ان میں سنگریزے بھی شامل ہیں۔ اور اگر کوئی ایسا کرے تو کیا اس کو صحیح دل و دماغ کا مالک قرار دیں گے؟ متوازن دل و دماغ کا آدمی موتیوں کو کام میں لائے گا اور سنگریزوں سے کوئی سروکار نہ رکھے گا۔ حضرات محدثین نے صحیح اور غیر صحیح کو ایک دوسرے سے ممیز اور الگ تھلگ کرنے کے لئے باقاعدہ قواعد وضوابط بنائے۔ جھوٹے اور سچے راویوں کی پہچان کے لئے علم ''اسماء الرجال'' ایجاد کیا۔ کھرے کھوٹے میں تمیز کے لئے علم ''جرح وتعدیل'' مدون کیا۔ پھر ایک ایک حدیث کو جانچا اور ایک ایک راوی کو پرکھا۔ موضوعات کو الگ کردیا اور معتبر روایات کو علیحدہ کردیا۔ ہر روایت کی سند متعین کی اور ہر راوی کا نام ونسب اور زندگی کا بنیادی خاکہ منضبط کردیا۔

علماء حدیث نے حدیث کی صحت اور تنقید کا معیار بھی بتلا دیا اور موضوعات پر باقاعدہ کتابیں لکھیں۔ انہوں نے ایک ایک واضع حدیث کا پتہ لگا کر اس کا نام رجال کی کتابوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثبت کردیا۔ ایک ایک جھوٹی اور موضوع حدیث کا کھوج لگا کر احادیث موضوعہ کے مجموعے مرتب کردیئے۔ جن میں خوب واضح طور پر یہ بتایا کہ یہ حدیثیں جعلی ہیں۔ ان کو کوئی اصل حدیث نہ سمجھے۔ جس حدیث پر بھی کلام کیا پہلے اس کی سند بتائی۔ پھر اس کے راویوں کے صدق و کذب اور ان کے ثقہ وغیر ثقہ ہونے نیز ان کے حافظے کی قوت وضعف پر بحث کر کے نتائج مرتب کئے۔ پھر کسی حدیث پر کوئی حکم لگایا۔ اگر کسی حدیث کے موضوع اور غیر موضوع ہونے میں علماء حدیث کا اختلاف ہوا تو وہ تمام اختلاف بھی من و عن بیان کردیا تاکہ ہر کوئی خود دیکھ لے اور کھرا کھوٹا الگ کرلے۔ اس قدر جدوجہد کے بعد بھی اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ صحیح و غیر صحیح احادیث آپس میں غلط ملط ہیں تو اس پر اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ روز روشن میں سورج کے وجود کا انکاری ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کئے جانے والے جھوٹ کے قبول کرنے کا تو خیر سوال ہی کیا۔ محدثین نے تو یہاں تک کیا کہ جس راوی کو کسی ایک حدیث میں انہوں نے غلط بیانی کرنے کا مرتکب پایا اس راوی کی باقی حدیثوں کو بھی مردود قرار دے دیا۔ یہی نہیں محدثین نے اس شخص کی حدیث کو بھی قبول کرنے سے انکار کردیا جس کا حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت میں تو جھوٹ ثابت نہ ہو لیکن دیگر باتوں میں وہ جھوٹ بولنے کا عادی ہو۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر محدثین نے تو احتیاط کی انتہاء کردی اس سے زیادہ احتیاط عقل تصور کرنے سے قاصر ہے۔ انہوں نے ایک اصول کی حیثیت سے یہ طے کردیا کہ جس شخص نے اپنی پوری زندگی میں ایک مرتبہ بھی جھوٹ بولنے کا ارتکاب کیا ہو اس کی حدیث قبول نہ کی جائے۔

نہ کرلے محدثین نے یہاں تک اہتمام کیا کہ اس راوی کی روایت بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کے بارے میں یہ گمان ہی پیدا ہوگیا ہو کہ شاید بھولے سے کسی غلطی کی بناء پر یا کم فہمی کے نتیجہ میں وہ روایت کی صحت کو برقرار نہ رکھ سکا۔

غرض ایک طرف اگر واضعین حدیث تھے تو دوسری طرف محدثین کی مقرر کردہ نقد رواۃ و رجال کی کسوٹی تھی جس نے کھرے اور کھوٹے کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے ایسا محیر العقول کارنامہ انجام دیا کہ علم سیر و سوانح کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

موضوع احادیث کی موجودگی کی بنیاد پر منکرین حدیث کا احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے ذخیرہ کو ناقابل اعتبار ٹھہرانا ایک ایسی نرالی منطق ہے جو عقل کے کسی بھی معیار پر پوری نہیں اتری۔ منکرین حدیث کا منشاء تو یہ ہے کہ وضع حدیث کے بہانے حدیث کی حجیت کو مشکوک بنا دیا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وضع حدیث خود حجیت حدیث کی بڑی زبردست دلیل ہے۔ اس لئے کہ اگر حدیث حجت نہ ہوتی تو وضع حدیث کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔ وضاعین و کذابین اپنے دل و دماغ سے گھڑی ہوئی باتوں کو حدیث کا نام اس لئے تو دیتے تھے کہ وہ حدیث کے نام پر قبول کر لی جائیں۔ یوں تو ان کی بات کوئی بھی قبول نہ کرتا۔ مگر لوگوں کے درمیان حدیث کی حجیت چونکہ مسلم تھی اس لئے وضاعین خیال کرتے تھے کہ ہم حدیث کا نام لیں گے تو ہماری بات بھی حجت کے طور پر تسلیم کر لی جائے گی۔ نقل اس سکے کی گھڑی جاتی ہے جو بازار میں چلتا ہو جس سکے کو بازار میں کوئی قبول ہی نہ کرتا ہو بھلا اس کی نقل بنانے سے کسی کو کیا فائدہ۔ حدیث کا سکہ بازار علم میں چلتا تھا تو موضوع احادیث کے نقلی سکے گھڑے جا رہے تھے۔ مگر جہاں نقلی سکے گھڑنے والے موجود تھے وہاں ایسے ماہر صراف بھی موجود تھے جو جعلی اور اصلی سکوں کی خوب پہچان رکھتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف جعلی سکے بنانے والوں کے نام طشت از بام کر دیئے بلکہ ان کے بنائے ہوئے تمام جعلی سکے بھی الگ کر کے رکھ دیئے اور آئندہ آنے والوں کے لئے اس سلسلہ میں تمام ضروری معلومات مہیا کر گئے تاکہ کسی بھی مرحلے پر یہ جعلی اور نقلی سکے دوبارہ رواج نہ پا سکیں۔ غرض موضوع احادیث کی موجودگی ذخیرہ احادیث کو مشکوک بنانے کی بجائے اس کے اور زیادہ محفوظ ہونے کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔

حدیث دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کا پہلا حصہ اصطلاح میں ''سند'' کہلاتا ہے اور دوسرا حصہ ''متن'' کہلاتا ہے۔ ''سند'' ان رواۃ پر مشتمل ہوتی ہے جنہوں نے ترتیب کے ساتھ ''متن'' اپنے شیوخ سے اخذ کر کے اسے ضبط کر لیا اور ''متن'' ان کلمات و الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے جس کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول یا فعل سے ہوتا ہے۔ علماء حدیث جب کسی حدیث پر بحث کرتے ہیں تو سب سے پہلے اس کی سند کو دیکھتے ہیں۔ سند میں جتنے رواۃ ہوتے ہیں ہر ایک کو جانچتے ہیں، پرکھتے ہیں۔ اس کی حیثیت کو دیکھتے ہیں اور شروط صحت کے لحاظ سے اس کی حیثیت متعین کرتے ہیں۔ حدیث کی سند کو پرکھنے کے لیے علماء حدیث کے سامنے بہت سارے پہلو ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے جانچ پڑتال اور چھان پھٹک کے لیے جو اصول و قواعد اور قوانین متداول ہیں انہیں اصطلاح میں اصول روایت کہا جاتا ہے۔ سند کی چھان بین کے بعد دوسرا مرحلہ ''متن'' کی تحقیق اور تجزیہ کا ہوتا ہے۔ محدثین نے جہاں اسناد کی تحقیق میں انتہائی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے وہاں

نظر رکھا انہیں اصطلاح میں ''اصول درایت'' کا نام دیا۔ احادیث کے بارے میں ایک یہ غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے کہ روایات کو اسناد کے لحاظ سے تو پرکھا گیا لیکن متون قابل اعتماد نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ علماء حدیث نے اسناد اور متن دونوں پر کام کیا ہے۔ متن کی پرکھ کے لحاظ سے وضعی احادیث کی علامات درج ذیل ہیں:

۱- روایت تاریخ کے خلاف ہو۔ جیسا کہ کہا جائے کہ عبداللہ بن مسعود نے جنگ صفین میں یوں فرمایا حالانکہ حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت عثمان کی خلافت میں وفات پا چکے تھے۔

۲- اگر راوی کسی حدیث کو بیان کرنے میں اکیلا ہو اور کوئی راوی اس حدیث کا نہ ہو تو ایسی حدیث منکر ہے۔

۳- ایسی حدیث بیان کرنا جس کا جاننا اور اس پر عمل کرنا سب مکلفوں پر واجب ہو اور راوی اس حدیث کو بیان کرنے میں اکیلا ہو تو یہ مضبوط قرینہ حدیث کے جھوٹا اور موضوع ہونے پر ہے۔

۴- حدیث عقل اور شرع کے مقتضیٰ کے مخالف ہو اور قواعد شرعیہ اس کو جھوٹا ٹھہراتے ہوں۔

۵- حدیث میں کوئی قصہ ایسے امر محسوس کے متعلق ہو کہ اگر درحقیقت وہ واقع ہوا ہوتا تو لاکھوں انسان اس کو نقل کرتے۔

۶- حدیث میں معنی رکیک ہوں مثلاً الفاظ ایسے ہوں جو قواعد عربیہ کے مطابق نہیں یا معنی ایسے ہو جو شان نبوت اور وقار رسالت کے شایان شان نہیں۔

۷- چھوٹے سے گناہ پر سخت وعید کی گئی ہو یا تھوڑے عمل پر بڑے ثواب کا وعدہ ہو۔

۸- خود وضع کرنے والا اقرار کرے کہ اس نے خود یہ جھوٹی حدیث بنائی ہے۔

۹- روایت میں پیشینگوئی ماہ و سال کے تعین کے ساتھ ہو وغیرہ وغیرہ۔

محدثین نے جس آزادی کے ساتھ احادیث پر تنقید کی ہے اس کی نظیر ہمیں دوسری جگہ نہیں ملتی۔ ان کے سامنے دنیوی وجاہت کوئی قابل توجہ چیز نہ تھی۔ بلکہ بڑے سے بڑے آدمی کے چال چلن پر وہ اسی طرح تنقید کرتے تھے جیسے معمولی آدمی پر اور جب ان پر یہ ثابت ہو جاتا کہ ایک شخص نے عمداً ایک لفظ بھی جھوٹا حدیث میں ڈال دیا ہے تو خواہ وہ کتنا بڑا آدمی ہوتا مگر اس کی روایت کو وہ ہرگز نہ لیتے۔

علاوہ ازیں علم جرح (گواہ کو بے اعتبار ثابت کرنا) اور تعدیل (اس کو صادق اور قابل اعتبار ثابت کرنا) جو علم حدیث کی ایک نہایت ضروری فرع ہے۔ اس کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں پڑ چکی تھی۔ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اجازت دی تھی کہ شہادت کے پرکھنے کے لیے گواہ کے چال چلن کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ اور قرآن کریم بھی فرماتا ہے ﴿ان جاء کم فاسق بنبافتبینوا﴾ یہ تو صحابہ کے زمانے کا حال تھا اور جب تابعین کے زمانہ کو دیکھتے ہیں تو اس زمانے میں ہر راوی کے متعلق جرح و تعدیل کرنے کا رواج عام ہو گیا تھا اور اسی زمانہ میں مشہور محدث اور امام حدیث یحییٰ بن سعید قطان اور شیبہ بن حجاج نے اس علم کے متعلق تحقیقات کر کے واقعات کو جمع کیا۔ اس تحقیق میں جو

قوتِ ضبط وغیرہ کو زیر بحث لایا جاتا تھا اور یہ کسی صورت بھی ممکن نہیں کہ اگر تابعین کو یا ان کے بعد آنے والی نسلوں کو ایک صحابی کے متعلق بھی کسی حدیث کا وضع کرنا ثابت ہو جاتا تو وہ صحابہ پر وہی جرح نہ کرتے جو دوسروں پر انہوں نے کی۔مگر اصل بات یہ ہے کہ خود صحابہ کو اور پھر ان سے بعد ہر ایک نسل کو یہ یقین کامل تھا کہ کسی صحابہ نے عمداً کوئی جھوٹی حدیث بنا کر مشہور نہیں کی اور اسی لیے تمام محققین کا اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ کسی صحابہ نے عمداً کوئی جھوٹی حدیث بنا کر مشہور نہیں کی اور اسی لیے تمام محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ صحابہ پر جرح کی ضرورت نہیں۔بلکہ جب ایک حدیث ایک مشہور صحابی تک راویوں کے معتبر سلسلہ سے پہنچ جائے تو پھر اسے صحیح اور قابل اعتبار مان لیا جائے۔اگر یہ خصوصیت صحابہ کو نہ ہوتی کہ ان میں سے کسی نے کوئی حدیث جھوٹی نہیں بنائی تو محدثین ان کو بھی علم الجرح والتعدیل کے تحت اسی طرح لاتے جس طرح وہ تمام دوسرے راویان حدیث کو لائے۔

اس تمام بحث سے یہ قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی نے کبھی کوئی حدیث وضع نہیں کی۔پس محدثین صرف انہی حدیثوں کو لیتے تھے جن کی روایت معتبر راویوں کے ذریعہ کسی مشہور صحابی تک پہنچے اور ان کا سب سے پہلا فرض یہ تھا کہ وہ دیکھیں کہ آیا جن لوگوں نے اس حدیث کو بیان کیا ہے وہ اعتبار کے قابل گواہ ہیں یا نہیں۔جن مراحل کو طے کر کے علم حدیث دوسری صدی ہجری کے آخر تک پہنچ گیا۔ان سے تحقیقات آسان ہو گئی تھی۔کیونکہ ہر ایک مرحلہ پر جو ائمہ حدیث حدیث کو لیتے اور پھر اسے آگے پہنچاتے تھے وہ پچھلے راویوں کی جرح وتعدیل کے بعد اور اس کو سمجھ کر کہ واقعی یہ حدیث قابل اعتبار ہے اسے قبول کرتے اور آگے پہنچاتے تھے۔

علاوہ ازیں ابتدائی زمانہ تابعین میں ائمہ حدیث جو حدیث کے محافظ اور سکھانے والے تھے تھوڑے اور مشہور آدمی تھے۔اور ان کے حالات صدق اور حفظ وغیرہ کے متعلق بھی مشہور تھے۔کیونکہ وہ پہلے زیر تنقید آ چکے تھے۔اس لیے محدثین نے جب دوسری صدی ہجری کے اخیر پر حدیث کو کتابوں میں لکھنا شروع کیا تو انہوں نے سب سے پہلی احتیاط یہ کی کہ جس راوی کے حالات معلوم نہیں اس کی حدیث کو قبول نہ کیا جائے کیونکہ اس کے صدق پر یا حافظہ پر کوئی جرح نہ ہو سکتی تھی۔ایسے ہی اور بھی کئی ایک قواعد اس علم کے انہوں نے مقرر کیے جن سے راوی کے اعتبار کا اندازہ کیا جاتا۔اگر ثابت ہو جائے کہ اس نے عمداً کوئی حدیث وضع کی ہے تو ایسے شخص کی کبھی کوئی حدیث نہ لی جاتی۔ایسا ہی اگر کسی راوی کے متعلق معلوم ہو کہ وہ حدیث کی روایت میں اکثر غلطی کرتا ہے تو اس کا ضبط اور حافظہ ناقابل اعتبار مانا جاتا۔راوی کی صداقت اور اس کی راستبازی کو خصوصاً بہت باریک نظر سے تحقیق کی جاتی۔یہ بھی دیکھا جاتا کہ آیا ایک شخص جو روایت کرتا ہے اس کا اس شخص سے جس سے وہ روایت کرتا ہے ملنا بھی ممکن تھا یا نہیں۔بلکہ محدثین نے اس سے بھی زیادہ احتیاط کی ہے انہوں نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ واقعی ایک کا دوسرے سے ملنے کا ثبوت ہونا چاہیے اور بغیر اس کے حدیث قبول نہیں کی جائے گی۔

چنانچہ امام بخاری نے اپنی تحقیقات میں اس بات کو ضروری سمجھا۔ایسا ہی راوی کے حافظہ وغیرہ کے متعلق شہادت لی جاتی۔ان اصول وقواعد کی رو سے راوی اور اس کی روایت کو معتبر یا غیر معتبر قرار دیا جاتا تھا۔اس میں شک نہیں کہ وہ

ہر مرحلہ پر انہی تمام اصول اور قواعد سے کام لیا گیا تھا اور جس طرح علم حدیث ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا رہا اسی طرح اس کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم تنقیدی بھی پہنچتے رہے۔ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں ائمہ حدیث کی تعداد ایسی زیادہ نہ تھی اور ان کے حالات بھی مشہور و معروف تھے۔ البتہ بعد کے زمانہ میں حدیث کے راویوں اور علم حدیث کو پھیلانے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ محدثین نے خود احادیث کو پوری تنقید و تحقیق کے بعد قبول کیا اور پھر اپنے شاگردوں کو حدیث سکھانے کے علاوہ یہ تنقید کے علوم بھی سکھائے۔ پس حدیث کے ساتھ ساتھ تنقید و تحقیق کے اصول بھی جمع ہوتے گئے۔ تابعین کے زمانہ میں بھی علم جرح و تعدیل کے امام پائے جاتے تھے۔ پس اگرچہ ان محدثین کی راہ میں جنہوں نے تیسری صدی ہجری کے شروع میں حدیث کی کتابوں کو لکھنا شروع کیا بہت سی مشکلات تھیں مگر یہ مشکلات ایسی نہ تھیں جن کا حل کرنا محال ہوتا۔ بلکہ ان کے حل کرنے کے سامان بھی موجود تھے۔ ہر محدث نے اپنے اپنے طریق سے تخریج احادیث کی۔ ہر محدث کی آزادانہ تحقیق صحت حدیث پر ایک کھلا کھلا گواہ ہے۔ الگ لگ راہوں پر چل کر محدثین ایک ہی نتیجہ پر پہنچے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی احادیث کے یہ مجموعے قابل اعتبار ہیں اور کم از کم یہ کہ جن احادیث پر دو دو تین تین چار چار محدثین کا اتفاق ہو گیا ہے ان کی صحت میں عموماً کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ مختلف زمانوں میں مختلف ممالک میں مختلف آدمیوں کا اپنے اپنے طور پر تحقیقات کر کے سب کا ایک ہی بات پر متفق ہو جانا اس بات کی صحت پر ایک بڑی بھاری شہادت ہے۔ مثلاً جو کتابیں دوسری صدی ہجری کے نصف میں لکھی گئیں اور جو تیسری صدی ہجری میں لکھی گئیں وہ بھی ایک دوسرے کی تائید ہی کرتی ہیں اور سوائے اس کے کہ پچھلی کتابیں جامع ہیں اور کوئی اختلاف ایسا نظر نہیں آتا جس سے احادیث کے قابل اعتبار ہونے پر شبہ ہو۔ بلکہ تمام بڑی بڑی باتوں اور اہم امور میں ان سب کا اتفاق ہے۔

حدیث کی وجہ سے لوگ فرقوں میں تقسیم ہو گئے

سنت ہی وہ واحد قوت تھی جس نے بڑے بڑے اختلافات کو دور کرنے میں مدد دی ہے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے معاً بعد یہ زبردست اختلاف سامنے آیا کہ منصب خلافت کس کو سونپا جائے۔ انصار اس کے زیادہ حقدار ہیں یا مہاجرین؟ انصار کا اعلان تھا کہ "منا امیر و منکم امیر" "ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم میں سے" یہ اختلاف ظاہر ہے کہ برے خطرناک اور دوررس نتائج کا حامل تھا اور اس اختلاف کا باقی رہنا امت مسلمہ کے لئے ایک بڑے فتنے کا باعث بنتا۔ اس نازک موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں۔

"الائمة من قریش"۔ ''امام قریش میں سے ہوں گے۔''

بعض روایات میں اتنا اضافہ ملتا ہے:

ا- فتح الباری شرح صحیح بخاری پ۱۴ص ۳۶۵

یعنی جب انصار نے یہ حدیث سنی تو سر تسلیم خم کر لیا اور اپنا دعویٰ واپس لے لیا۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قریشی اسلام لانے میں بھی سب مسلمانوں پر سبقت رکھتے ہیں اور دوسرے تمام عرب میں جو اثر رسوخ اور رعب دبدبہ ان کا ہے وہ کسی اور قبیلے اور گروہ کو حاصل نہیں ہے اس لئے قریش کے ہوتے ہوئے کسی اور قبیلے اور گروہ کی امامت کا کامیاب رہنا انتہائی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔اس بات کو دوسری حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا"خیارکم فی الجاھلیة خیارکم فی الاسلام اذا فقھوا۔" (۱)

''جو جاہلیت میں بہتر تھے اسلام میں بھی بہتر شمار ہوں گے بشرطیکہ ان کو دین کا فہم اور تفقہ حاصل ہو۔''

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نہایت ہی حکیمانہ ارشاد کی وجہ سے ایک بہت بڑا فتنہ بہت آسانی سے دب گیا۔

جس طرح عام اشخاص کا ورثہ ان کی وفات کے بعد ان کے عزیز و اقارب میں تقسیم ہوتا ہے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا خیال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ورثہ بھی وارثوں میں تقسیم ہونا چاہئے۔اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث پیش کی:

لا نورث ماترکنا صدقه (۲)

''ہمارا ورثہ تقسیم نہیں ہوتا ہم جو کچھ چھوڑیں صدقہ ہے۔''

چنانچہ یہ واضح ہوتے ہی کہ نبی کا ورثہ اولاد کو نہیں ملتا بلکہ تمام امت کو ملتا ہے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا مطمئن ہو گئیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک مسئلہ یہ بھی پیدا ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعش مبارک کو کہاں دفنایا جائے؟ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آبائی وطن مکہ لے جا کر سپرد خاک کیا جائے۔ بعض کا خیال یہ تھا کہ یہیں مدینہ کو ہی یہ سعادت نصیب ہونی چاہئے۔صحابہ کے ایک گروہ کا خیال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت المقدس میں سپرد خاک کیا جائے، کیونکہ وہاں دوسرے انبیاء علیہم السلام بھی مدفون ہیں۔اس بات پر بھی اختلاف بڑھ گیا۔لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث پیش کر کے اس مشکل کو حل کر دیا۔حدیث یہ تھی:

انه لم یدفن نبی قط الاحیث یقبض (۳)

''نبی وہیں دفنایا جاتا ہے جہاں اس کی روح قبض ہوتی ہے۔''

چنانچہ جس حجرہ مبارک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مالک حقیقی سے جا ملے تھے وہیں قبر کھودی گئی اور آپ صلی

۱- مشکوٰۃ باب مناقب قریش

۲- صحیح مسلم کتاب المغازی

۳- ترمذی کتاب الجنائز باب این تدفن الانبیاء

مقام پر یہ اطلاع ملی کہ شام میں شدید طاعون پھیل گیا ہے۔اس موقع پر کچھ حضرات کا خیال تھا کہ واپس جایا جائے۔جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ شامل تھے اور بعض حضرات شام جانے پر مصر تھے۔اس موقع پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث پیش کی کہ ''جہاں وباء پھیلی ہو، وہاں سے نہ کوئی نکلے اور نہ کوئی ایسے علاقہ میں داخل ہو۔''

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی کہ ان کی رائے حدیث کے موافق ہی نکلی۔(۱)

ان روایات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرن اول میں سنت ملت کے اختلاف نہیں بلکہ اتحاد کی بنیاد تھی۔اسلامی تاریخ کے مستند اور قابل اعتماد ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہی یا فروعی اختلافات نے صحابہ تابعین اور اماماں دین کے زمانہ میں وہ شدت اختیار نہیں کی تھی جو بعد میں رونما ہوگئی۔دراصل یہ شدت اور فرقہ ورانہ عصبیت دور انحطاط کی پیداوار ہے نہ کہ دور ترقی کی۔اسلاف کرام میں فقہی اختلافات کے متعدد اسباب ہیں جن میں سے ایک سبب کی وضاحت کی جاتی ہے۔حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ (یہود قبیلے) پر حملہ کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی ایک جماعت کو حکم دیا:

لایصلین احدکم صلوۃ العصر الا فی بنی قریظۃ

یعنی تم میں سے کوئی نماز عصر ادا نہ کرے مگر بنی قریظہ کے علاقے میں۔

لیکن اتفاق سے راستے میں ہی عصر کا وقت آگیا۔اس موقع پر فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح میں فہم کے اختلاف کی وجہ سے دو رائے ہوگئیں۔ایک رائے یہ تھی کہ حدیث کے ظاہری الفاظ کی بناء پر ہمیں بنی قریظہ ہی میں نماز عصر ادا کرنی چاہئے، دوسری رائے یہ تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اتنی جلدی سفر طے کرنا چاہئے کہ عصر کے وقت تک بنی قریظہ کے علاقے میں پہنچ جائیں۔اب جبکہ باوجود کوشش کے ہم بنی قریظہ کے علاقے میں نہیں پہنچ سکے تو ہمیں نماز قضاء کرنے کی بجائے راستے ہی میں ادا کر لینی چاہئے۔جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس اختلاف کی تفصیل پیش کی گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں میں سے کسی بھی کو ملامت نہ کی۔(۲)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اسلاف صالحین کے درمیان ایک سے زیادہ آراء کا ظہور اس بناء پر ہوا کہ کسی آیت یا حدیث کے مفہوم کو متعین کرنے میں اختلاف رونما ہوگیا۔یہ اختلاف سمجھ کا اختلاف تھا نہ کہ کوئی بنیادی اور حقیقی اختلاف۔ اسی وجہ سے سلف صالحین اختلاف رائے کے باوجود باہمی بغض وعناد اور مخالفت کا شکار نہیں ہوئے اور نہ انہوں نے کبھی یہ گوارا کیا کہ ملت اسلامیہ اس قسم کی صورت حال کی وجہ سے مختلف فرقوں میں تقسیم ہو اور نوبت یہاں تک پہنچے کہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا ہی گوارا نہ کریں۔

منکرین حدیث حدیث کو تو سرچشمہ اختلاف گردانتے ہیں لیکن یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا یہ حدیث کا دامن چھوڑ کر خود

۱- تاریخ الامت ج ۲ ص ۹۸

۲- صحیح بخاری۔باب صلوۃ الخوف

گو سنت کی بناء پر فقہی مسائل اور جزئیات میں اختلاف بڑھ کر دور انحطات میں شدت اختیار کر گیا لیکن آئمہ کرام کے درمیان بڑی رواداری اور محبت تھی۔ آپس میں اختلافات کے باوجود ان کے درمیان نہایت گہرے دوستانہ روابط قائم تھے اور وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا قطعاً ناگوار محسوس نہ کرتے تھے۔ تاریخ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں اور نظائر موجود ہیں۔

فرقہ اہل قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کے عمل کی بنیاد قرآن خالص ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ ان کے عمل کی بنیاد پر کسی قسم کا اختلاف نہ ہو لیکن ان کے عمل کی کیا کیفیت ہے۔ اس کے لئے صرف ایک مثال پر اکتفاء کرتے ہیں اور وہ بھی نماز کے اوقات کے سلسلے میں جو (ان کے دعویٰ کے مطابق) ان کا امتیازی کارنامہ ہے۔ اس فرقے کے بانی مولوی چکڑالوی قرآن خالص سے ثابت کرتے ہیں کہ نماز پانچ وقتوں کی ہے۔ (ملاحظہ ہو ترجمۃ القرآن از مولوی عبداللہ چکڑالوی پ۴ ص ۶۳ و دیگر مقامات)

اس فرقہ یا عقیدہ کے متبع بلاغ القرآن والے اسی قرآن سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ نماز تین وقتوں کی ہے۔ اب پوچھنے والے پوچھتے ہیں کہ جب قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ اس سے پانچ وقتوں کی نماز ثابت ہو جاتی ہے اور تین وقتوں کی بھی تو اس کے لئے اس دعویٰ کے متعلق کیا کہا جائے گا کہ "ولو كان من عندالله لوجدوا وفيه اختلا ف كثيرا۔" اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلاف پاتے۔ (اور یہ تو صرف مسئلہ اوقات صلوٰۃ کے متعلق ہے اگر دیگر مسائل کو بھی دیکھا جائے تو نا معلوم ان میں کس قدر باہمی اختلافات ملیں جن میں سے ہر ایک کے متعلق یہ دعویٰ ہو کہ وہ قرآن سے ثابت ہے۔ یہ ہے ان حضرات کا وہ مسلک جس نے قرآن مجید کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے کہ اس سے اس کا بنیادی دعویٰ ہی (معاذ اللہ) باطل ہو جاتا ہے۔ (۱)

اہل قرآن نے احادیث کا کلیتاً انکار کر دیا اور "حسبنا كتاب الله" کہہ کر اس پر انحصار کیا لیکن اب مشکل یہ پیش آئی کہ قرآن کریم ارکان اسلام کی جزئیات تک بیان کرنے میں ساقط تھا اب احادیث کی بجائے محض اپنے غور و فکر کا سہارا لینا پڑا۔ پھر ان میں سے بعض نے متواتر اعمال کا سہارا لیا لیکن پھر بھی بات بنائے نہ بن سکی۔ آخر ان سب دوستوں میں شدید اختلافات رونما ہوئے اور جوت و پیزار بھی ہوئی۔ نتیجتاً ان کے بھی کئی فرقے بن گئے جو صرف ایک نماز کے معاملہ میں ہی کئی طرح کے اختلافات رکھتے تھے۔ اور وہ اختلافات بھی اصولی قسم کے تھے۔ مثلاً کچھ فرقے صرف دو نمازیں پڑھتے تھے۔ کچھ کہتے تھے کہ قرآن سے صرف تین نمازوں کا ثبوت ملتا ہے۔ لہٰذا تین نمازوں میں یہ لوگ صرف قرآنی آیات ہی پڑھتے ہیں خواہ قیام یا رکوع، سجدہ ہو یا جلسہ۔ پھر کچھ ایسے ہیں جو سلام پھیرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ اتنے اختلافات تو صرف نماز میں ہوئے باقی احکام میں جس قدر اختلافات ہو سکتے ہیں اس کا آپ خود اندازہ فرما لیجئے (۲)۔

۱- قرآنی فیصلے ج دوئم دوسرا ایڈیشن طلوع اسلام ٹرسٹ ص ۲۳۳

۲- آئینہ پرویزیت ص ۱۱۸

واضح ہوگا کہ اختلاف کا شکار منکرین حدیث زیادہ ہیں۔مسلمانوں کے تمام فرقے فرض نمازوں کے پانچ ہونے میں اختلاف نہیں رکھتے۔اوقات کے تعین کے لحاظ سے اوقات نماز میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔صرف ایک یا دو مثل اسفار یا غلس کا معمولی سا اختلاف ہے لیکن کہاں کہ یہ اختلاف کے سرے سے نماز ہی غائب یا صرف دو یا تین نمازوں کا فتویٰ دیا جارہا ہے۔نماز کے صریح منکر بھی دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ایک گروہ کا مسلک ہے کہ نماز سے مراد غرباء و مساکین کی شکم پروری ہے اور دوسرے کا خیال ہے کہ اٹھتے بیٹھتے ''خدا کا پروپیگنڈہ کرو۔'' چند مثالیں پیش ہیں:

۱-مسلمانوں کا کام یذکرون الله قیاما...... اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کا پروپیگنڈہ کرنا۔'' (۱)

۲-ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو:

''قرآن کریم میں دو ہی نمازیں مذکور ہیں، فجر عشاء۔'' (۲)

نظام صلوٰۃ کیا ہے؟ لیکن قرآن نے اس تمام تفصیل کو سمٹا کر ایک فقرے میں لکھ دیا ہے۔ولم نك نطعم المسكين

درحقیقت یہ شیرازہ سنت ہی کے طفیل باہم مربوط چلا آرہا ہے ورنہ انکار سنت نے تو اس میں نت نئے اختلافات پیدا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سید الانبیاء نہیں ہیں

چکڑالوی صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سید الانبیاء نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کہ

''حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں متبع اور مقتدی کل انبیاء کا عموماً اور ابراہیم علیہ السلام کا خصوصاً لقب مرحمت فرمایا ہے۔'' (۳)

چکڑالوی صاحب کا خیال ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو سید الانبیاء کہنے سے دوسرے انبیاء و رسل کی تحقیر ہوتی ہے۔"لا نفرق بین احد من رسل" کا کفر ہوتا ہے۔(۴)

چکڑالوی صاحب کو "لا نفرق" والی آیت قرآن مجید میں نظر آگئی مگر ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (البقرہ (۲): ۲۵۳) کہیں نظر نہیں آیا۔پہلی آیت میں مقام رسالت کا ذکر ہے رسول ہونے کی حیثیت سے تمام انبیاء برابر ہیں۔دوسری آیت میں انبیاء کے درجات کا بیان ہوا ہے۔اس پہلو سے انبیاء میں فرق ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ انبیاء کی اتباع کا حکم نہیں دیا

۱- ایک اسلام ص ۳۱۳

۲- از خواجہ عبداللہ اختر طلوع اسلام اگست ۱۹۵۰ء

۳- اشاعۃ القرآن مئی ۱۹۲۲ء ص ۱۳

۴- ایضاً

"فبھداھم اقتدہ" اور یہ ہدایت منزل من اللہ اور سب انبیاء پر ایک جیسی ہوتی ہے۔ اور ابراہیم کی ملت کی اتباع کا ذکر فرمایا ہے اور ملت سے مراد وہ نظام دین ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے تو قائم فرمایا تھا۔ نظام دین کے قیام میں پیش آمدہ مشکلات میں اگر سابقہ انبیاء کی ایسی ہی مشکلات اور صبر و ثبات کا حوالہ دے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کے طریق کار کی اتباع کی ہدایت کی گئی ہے تو اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ کیسے کم ہو گیا؟ درجہ کی فضیلت تو یوں معلوم ہوتی ہے کہ اس نظام دین کو قائم کرنے میں کون سا رسول سب سے زیادہ کامیاب رہا؟ اور قرآن و حدیث اور تاریخ شاہد ہے کہ اس پہلو سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ بلند درجہ پر ہیں۔

چکڑالوی صاحب کو صحیح بخاری اور صحاح کی دیگر کتابوں میں یہ حدیث "انا سید ولد آدم و لا فخر" بھی کہیں نظر نہ آئی۔ اس حدیث کی رو سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام بنی نوع انسان کے سردار ہیں۔ جن میں تمام انبیاء و رسل بھی شامل ہیں۔ نہ ہی چکڑالوی صاحب کو یہ حدیث نظر آئی کہ

''اگر آج موسیٰ زندہ ہوتے تو انہیں میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔''

کل احکام شرعیہ قرآن مجید میں مفصل و مشرح طور پر موجود ہیں۔ حدیث کی ضرورت نہیں

قرآن مجید ایک کامل کتاب ہے مگر اس کو سمجھنے کے لیے حدیث کی ضرورت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کے پہلے مفسر ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اہل علم اور مفسرین نے اپنے اپنے زمانے میں لوگوں کو قرآن مجید کا مفہوم سمجھانے کے لیے بہت کچھ لکھا ہے۔ حتیٰ کہ مولوی عبداللہ صاحب کو ایک ضخیم ترجمہ، تفسیر، نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق کتابیں لکھنی پڑیں تا کہ قرآن کریم کے اصل منشاء سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔

مولوی عبداللہ صاحب خود ہی فرماتے ہیں کہ قرآن مفصل ہے اس میں تفصیل کل شئی ہے۔ کسی قسم کی تشریح یا تفصیل کی حاجت ہی اس نے باقی نہیں چھوڑی۔ ساری تشریحات اور تفصیلات قرآن مجید کے اندر موجود ہیں۔ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب یہ سب فرمانے کے بعد قرآن مجید کے ایک حکم "اقیموا الصلوٰۃ" کی تشریح کے لیے ''برہان الفرقان علی صلوٰۃ القرآن'' پوری ایک کتاب لکھ دیتا ہے۔ جب قرآن مجید میں ہر چیز مفصل و مشرح موجود ہے تو پھر اس کتاب کی کیا ضرورت تھی؟ اسی طرح اس نے قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر بھی لکھی۔ حالانکہ مولوی عبداللہ کے عقیدہ کی رو سے مزید تفصیل و تشریح کی کوئی حاجت نہیں۔

رسول کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن کے قلب مقدس پر کلام اللہ نازل ہوا اور دنیا کے تمام انسانوں سے بڑھ کر کلام اللہ کے منشاء کو سمجھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس منشاء خداوندی کو لوگوں پر ظاہر فرمایا۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور فعل سے قرآن مجید کی تشریح بیان کی۔ لوگ قرآن مجید کے اصل منشاء کو سمجھنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ

مولوی عبداللہ صاحب کے سامنے جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرآن مجید کے بارے میں تفسیر آئے تو اس سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں قرآن مفصل اور مشرح ہے اور دین اسلام میں حدیث پر عمل کرنا تو ''سراسر کفر، شرک، ظلم اور فسق ہے۔'' دوسری طرف قرآن مجید کے مفصل ہونے کے باوجود چکڑالوی صاحب نے خود اپنے پیروکاروں کو قرآن کا فہم دینے کے لیے تفسیر القرآن لکھی۔ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قرآن کے بارے میں تفسیر کی ضرورت نہیں اور مولوی عبداللہ چکڑالوی کا فہم قرآن عین ہدایت ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

"تفصیل کل شئی" سے دنیا کی ہر ایک چیز مراد نہیں ہے۔ اہل قرآن کو بھی "کل شئی" پر ''دین کی کل باتیں'' کی قید لگانی پڑی۔ لیکن دین تو بہت سارے اصول اور بے شمار فروع پر حاوی ہے۔ مثلاً سیاست بھی دین میں داخل ہے۔ معاشرت بھی تمدن بھی۔ اگر یہ دین میں داخل نہ ہوتے تو قرآن مجید ان کے اصول کیوں بیان فرماتا۔ لیکن ان ہی امور کے فروع ہزار ہا باتوں پر مشتمل ہیں جن پر ایک زمانے اور ایک سوسائٹی کے انسان حاوی نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح گذشتہ انبیاء کے تذکروں کو دین میں داخل کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ مگر تمام انبیاء کے مفصل تذکرے نہیں ہیں۔ بلکہ بعض انبیاء کی زندگی کے نہایت قلیل واقعات کا ذکر ہے۔ پھر تفصیل کل شئی کیسے ہوا؟

حقیقت یہ ہے کہ کل شئی سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہر وہ چیز بیان کر دی گئی ہے جس کی ضرورت دشمن کے مقابل پر تھی۔ اس طرح قرآن مجید تفصیل کل شئی بے شک ہے۔ مگر اس لحاظ سے کہ جس قدر ضرورت اعدائے دین کے مقابل پر ہے۔ جس قدر دوسرے مذاہب کے متعلق ہے جن سے دنیا میں اسلام کو کام پڑنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں قرآن مجید کو کل شئی کہا گیا ہے وہاں ساتھ ہی دوسرے مذاہب کا بھی ذکر ہے۔

﴿مَاكَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَىْءٍ﴾ (یوسف (۱۲):۱۱۱)۔

''یہ کوئی افتراء کی ہوئی بات نہیں بلکہ جو کچھ اس سے پہلے موجود ہے اس کی تصدیق اور ہر شے کی تفصیل ہے۔''

﴿اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا﴾ (الانعام (۶):۱۱۴)۔

کتاب مفصل کا ذکر مخالفین کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔ اور در حقیقت ان سب آیات میں یہ بتایا ہے جیسا کہ قرآن مجید نے دوسری جگہ بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن میں اپنی صداقت کے تمام دعوے اور ان کے دلائل اور مخالف مذاہب کے سارے اصول باطلہ اور ان کے بطلان کے دلائل موجود ہیں۔ فی الواقع قرآن مجید کی عظمت کا کمال ہے کہ ملک عرب کا ایک امی وہ کتاب دنیا میں پیش کرتا ہے جس نے نہ صرف سارے مذاہب کے اصول باطلہ کو ہی بیان کر کے ان کی غلطی کا اظہار کیا بلکہ اس کے دلائل بھی پیش کیے۔ حالانکہ وہ شخص ایسا ہے کہ دوسرے مذاہب کا مطالعہ تو ایک طرف رہا وہ لکھنا پڑھنا ہی نہیں جانتا۔ اور اسی طرح تمام اصول حق کو بیان کر کے ان کی صداقت کے دلائل بھی بیان کرتا ہے۔

قرآن شریف کا ایک عجیب معجزہ ہے کہ یہ دعویٰ بھی خود کرتا ہے اور دلیل بھی خود دیتا ہے۔ اور اسی کی طرف

قرآن مجید میں موجود ہے۔اس کا پیروکار اس کا محتاج ہے۔یہ نہیں کہ دوسری کتابوں کی طرح اپنے پیروکاروں کی محتاج ہو۔ یہ پہلوں کی تصدیق بھی کرتا ہے۔یہ بھی سکھاتا ہے کہ فی الواقع تمام انبیاء خدا کی طرف سے آئے اور اپنی اپنی قوم کی ہدایت کے لیے ان پر کتابیں اتاریں اور ساتھ ہی ہر شے کی تفصیل بھی اس کے اندر موجود ہے۔یعنی جو غلطیاں ان میں داخل ہوگئیں ان کو بھی بتادیا اور ان کے بالمقابل صحیح اصول کو بھی بیان کرتا ہے اور دعویٰ کے ساتھ دلائل بھی خود دیتا ہے۔

کس قدر کمال کی کتاب ہے۔اول بتایا کہ سب مذاہب خدا کی طرف سے ہیں۔پھر یہ بتایا کہ ان کتابوں میں تحریف ہوگئی اور مرورِ زمانہ سے غلطیاں داخل ہوگئیں۔پھر جو اصولی غلطیاں تھیں وہ بتائیں۔پھر ان غلطیوں کے دلائل دیئے۔

ایک اور پہلو سے ہم اسی ''تفصیل کل شئی'' کے دعویٰ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے دین کے متعلق ہر معاملہ کے اصول کو بیان کردیا ہے اور فروع میں سے بھی کچھ بیان کردیا ہے۔نہ صرف دین اسلام کے اصول ہی یعنی اللہ تعالیٰ، فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان بلکہ سیاست، تمدن، معاشرت کے اصول، دنیا میں اختلاف مذاہب کے اصول بلکہ اختلاف میں فیصلے کے اصول بھی۔مگر فروع کا احاطہ نہ ہوسکتا تھا نہ اس لا حاصل کوشش کو قرآن نے کیا۔ہاں بطور نمونہ اور ضرورت کے لحاظ سے اس میں سے بھی کچھ بیان کردیا۔لیکن جملہ اصول کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کردیا۔اور پھر یہ قاعدہ بھی بتادیا کہ فروع میں جہاں کوئی امر متشابہ پیدا ہو اصول کی طرف رجوع کرکے اسے حل کیا جائے۔اس لیے تفصیل کل شئی قرآن شریف میں ان معنوں میں بھی ہے کہ تمام اصول کی تفصیلات اس کے اندر موجود ہیں اور پوری وضاحت موجود ہے۔وہاں کسی مزید توضیح کی چنداں حاجت نہیں۔چنانچہ اس بات کو خود قرآن شریف نے بیان فرمایا ہے۔

﴿هوالذى انزل عليك الكتاب منه ايات محكمات هن ام الكتاب واخر متشابهات﴾

''خدا وہ ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری۔اس میں کچھ آیات محکم یعنی واضح المعنی صریح الدلالت ہیں۔وہ کتاب کی اصل ہیں اور متشابہ ہیں۔'' یعنی جن کے معنی واضح نہیں ہیں۔اب اس آیت سے صاف ظاہر ہوگیا کہ قرآن مجید میں بعض آیات ایسی ہیں جو واضح المعنی نہیں بلکہ ان کی مزید تشریح وتوضیح درکار ہے۔

پس قرآن مجید ایک طرف تفصیل کل شئی بھی اپنے آپ کو کہتا ہے تو دوسری طرف اپنے اندر کچھ آیات متشابہ بھی قرار دیتا ہے۔دونوں آیتوں کو اکٹھا پڑھیں گے اور ان میں سے ایک کے ایسے معنی نہیں کریں گے جو دوسری آیت کے خلاف ہوں اور دونوں میں تطبیق بھی درحقیقت خود اسی آیت نے کردی ہے جو اس وقت زیر بحث ہے۔کیونکہ یہاں ایک حصہ کو واضح المعنی صریح الدلالت فرمایا۔دوسرے کو ایسا نہیں فرمایا اور یہ بھی بتادیا کہ وہ آیات جو واضح المعنی ہیں وہ اصول کتاب ہیں۔ بالفاظ دیگر قرآن کریم نے اصول کو لازماً ایسے الفاظ میں بیان فرمادیا ہے کہ مزید توضیح کی ضرورت نہیں۔مگر فروع کو ایسے رنگ میں بیان فرمایا ہے کہ ان کی مزید توضیح کی ضرورت ہے اور یہی ایک حکیم اور پرحکمت کتاب کا کام ہوسکتا تھا کہ اصول کو

خدائے عالم الغیب کی طاقت سے تو بڑھ کر نہیں مگر ان تمام فروع کا برداشت کرنا، ان سب کی حفاظت کرنا اور ان میں سے پھر اپنی ضرورت کے مطابق تلاش کرنا انسانی طاقت سے بالاتر تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا کہ انسان پر وہ بوجھ ڈالے جس کو وہ برداشت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اس طرح تو یہ قرآن مجید کروڑوں نہیں اربوں صفحوں کی کتاب بن جاتا اور کوئی اس سے کچھ بھی حاصل نہ کرسکتا، نہ اسے یاد رکھ سکتا۔ پس کمال حکمت سے ایک طرف اصول کو بالکل واضح اور صاف اور پختہ کر کے قرآن مجید میں ان سب کا ذکر کر دیا اور دوسری طرف فروع کے لیے اجتہاد کا دروازہ ضرورت کے مطابق کھلا رکھا۔ اب چونکہ فروع ہمیشہ اصول پر عرض کی جاتی ہے اور اصول کے مطابق ہونی چاہیے اس لیے یوں کہہ سکتے ہیں کہ سبھی کچھ بتا دیا۔ کیونکہ جب ایک چیز کے علم حاصل کرنے کا ذریعہ بتا دیا تو گویا اس کا علم ہی دے دیا۔

اس بحث کے بعد اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہوسکتی کہ قرآن مجید کی آیات کی مزید تفصیل وتشریح کی بھی ضرورت ہے اور ان لوگوں (مولوی عبداللہ) نے بھی اپنے عمل سے اس کا اعتراف کیا ہے جنہوں نے اپنے قول سے اس کی تردید کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نبی کو خاص فہم عطا کرتا ہے۔ یہ فہم معمولی اجتہاد سے بالاتر ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس خاص فہم سے کام لے کر یا وحی خفی کی مدد سے دینی امور میں فیصلہ کرتا ہے جن کی وضاحت کتاب اللہ نے نہیں کی اور اس وجہ سے کہ اس کو خاص فہم منجانب اللہ عطا ہوتا ہے وہ خاص اختیارات رکھتا ہے۔ اس کا فیصلہ امت کے لیے ایک قطعی فیصلہ ہوتا ہے۔ اجتہاد میں غلطی کا امکان ہے، مگر اس کے فیصلۂ دینی میں غلطی کا امکان نہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں صلوٰۃ کا حکم ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بتا دیتے ہیں کہ صلوٰۃ یہ ہے۔ اب یہ ناممکن ہے کہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے وہ غلط ہو یا قرآن مجید یا اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو۔

خلاصۃ البحث

حدیث کی صداقت اور صحت پر دو قسم کے حملے ہوئے۔ ایک بیرونی اور دوسرے اندرونی۔ بیرونی حملے سرولیم میور اور سپرنگر وغیرہ عیسائی مصنّفین کی طرف سے ہوئے اور اندرونی حملے مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی اور ان کے ہم خیال لوگوں کی طرف سے اور کسی قدر آزاد خیال لوگوں کی طرف سے۔

جہاں تک بیرونی حملہ آوروں کا تعلق ہے انہیں ایک حد تک حدیث کی صداقت کا اعتبار ہے اور اندرونی حملہ آور سارے عظیم الشان مجموعہ حدیث کو لغویات، ہزلیات، دوراز کار بے سروپا باتیں اور واضعین کی کاریگری قرار دیتے ہیں۔

مولوی عبداللہ چکڑالوی صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تیرہ سو سال بعد آکر یہ اعلان کر دیا کہ تمام احادیث مجموعہ اباطیل ہیں۔ اس میں ایک بھی قول یا فعل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں ہے۔ نہ حدیث کی ضرورت ہے۔ قرآن میں تمام احکام شرعی موجود ہیں۔ قرآن مفصل ومشرح، قرآن کو سمجھنے کے لیے حدیث کی ضرورت نہیں۔ چکڑالوی صاحب نے اس دعویٰ کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا ضخیم ترجمہ اور تفسیر لکھی اور قرآن کے صرف ایک حکم "اقیموا الصلاۃ" کے لئے ایک کتاب ''برہان الفرقان علی الصلوٰۃ القرآن'' لکھ ڈالی۔ گویا رسول اللہ ﷺ کی قرآن اور شرعی احکام کی وضاحت اور تشریح کی ضرورت نہیں مگر مولوی عبداللہ صاحب کا فہم اور تشریح قرآن عین ہدایت ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک

مولوی عبداللہ صاحب کو قرآن مجید کے مشرح ومفصل احکام میں پانچ وقت کی نمازیں نظر آتی ہیں۔ جب کہ ان کے پیروکاروں کو تین وقت کی۔ حقیقت یہ ہے

اور اہل قرآن میں کئی فرقے بن گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید ایک کامل کتاب ہے مگر اس کا فہم حاصل کرنے کے لئے ہم حدیث نبوی کے محتاج ہیں۔ اسلام دین فطرت ہے جس کی جملہ تفصیلات اور جزئیات کا علم قرآن مجید اور احادیث نبویہ کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے ان دونوں سرچشموں کی نوعیت لازم و ملزوم کی سی ہے۔ انہیں اگر کم فہمی اور کج بحثی سے ایک دوسرے سے جدا کرنے کی مذموم کوشش کی جائے تو اسلامی تہذیب وتمدن کے ایوان کی بنیاد ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید اگر وحی متلو ہے تو حدیث وحی غیر متلو ہے۔ جس محفوظ طریق پر قرآن مجید نازل ہوا، بعینہ اس کے اصولوں اور احکامات کی تشریح وتوضیح بھی پوری حفاظت اور ذمہ داری کے ساتھ انہی ہاتھوں سے محفوظ ہوئی، جنہیں قرآن مجید کی آیات بینات کو قید کتابت میں لانے کی سعادت اور توفیق مرحمت ہوئی۔ یہ کیسی عجیب بات ہوگی کہ جس زبان اور جن ہاتھوں سے آیات قرآنیہ نصیب ہوئیں بالکل اسی زبان اور انہیں ہاتھوں سے ملنے والی احادیث کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یوں حدیث اور حفاظت حدیث کے اہتمام سے انکار خود قرآن مجید کی حجیت اور قطعیت سے بالفعل اور بالعمل انکار پر مستلزم ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم(۵۳)۳،۴)

''آپ اپنی خواہش سے بات نہیں فرماتے بلکہ وہ تو وحی ہے جو آپ پر نازل کی جاتی ہے۔

امت مسلمہ کا یہ منفرد افتخار ہے کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمانی اور تشریعی تعلق کے باعث آپ کے اقوال، افعال، احوال، اعمال اور آثار حتیٰ کہ آپ کے شمائل وعادات کو بھی کمال عقیدت اور حزم واحتیاط کے ساتھ محفوظ کیا ہے۔ یہی باعث ہے کہ علوم الحدیث پوری انسانی تاریخ کا سب سے ممتاز اور اعلیٰ علم وفن ہے جس کے حفظ وانصرام میں انہوں نے اپنے دل ودماغ کی اعلیٰ ترین صلاحیتیں صرف کی ہیں کہ جس کی وجہ سے یہ علم مسلمانوں کے تخلیقی شعور کے اظہار کا سب سے مؤثر وسیلہ بن گیا ہے۔ علم الحدیث کی حفاظت مطالبہ ربانی بھی

تھا۔ وہ استثنائی روایت کہ جس میں ایک خاص موقع پر ایک مخصوص مصلحت کے تحت آپ نے قرآن کے علاوہ کچھ اور نہ لکھنے کی تاکید فرمائی، ان بیسیوں روایات کی نقیض نہیں ہوسکتی جس میں ان روایات کو لکھنے، سیکھنے، سکھانے اور دوسروں تک پہنچانے کی تلقین موجود ہے۔

تُسمَعُونَ وَیُسمَعُ مِنکُم وَیُسمَعُ مِمَّن یَسمَعُ مِنکُم

''تم لوگ مجھ سے سنتے ہو، دوسرے لوگ تم سے سنا کریں گے اور پھر ان سے اور لوگ سنیں گے اور پھر ان سے اور لوگ سنیں گے۔''

نَضَّرَاللّٰہُ امرًا سَمِعَ مَقَالَتِیْ فَوعَاھَا حَتّٰی یُؤَدِّیَھَا اِلٰی مَنْ لَم یَسمَعُھَا

''اللہ تعالیٰ اس شخص کے چہرے کو رونق اور روشنی عطا کرے جس نے میری بات سنی اور پھر یاد رکھی، یہاں تک کہ وہ بات اس شخص تک پہنچا دی جس نے اسے نہیں سنا۔''

مَنْ کَذَّبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ

''جو شخص جانتے بوجھتے میری طرف جھوٹی بات منسوب کرے گا تو اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔''

خطبۃ حجۃ الوداع جو انسانی تاریخ میں بنیادی حقوق کی سب سے اولین اور اہم ترین آئینی اور دستوری دستاویز ہے اسے بیان کرنے کے بعد آپ نے فرمایا:

فیبلغ الشاھد الغائب۔

''جو موجود ہیں وہ غیر موجود تک اسے پہنچا دیں۔''

اس نوعیت کے کلمات اور ارشادات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو اپنی احادیث دوسروں تک پہنچانے کی کس قدر فکر تھی کہ اس ذمہ داری کے لیے کئی نوعیت کے انتظامات کیے۔ ہمیں یہ علم ہونا چاہئے کہ یہ ذخیرۂ حدیث جو آج تک امت کی ہدایت کے لئے موجود ہے، یہ تین مستقل ذرائع سے منتقل ہوا ہے۔ عربوں کے حافظے کی خوبی سے کون واقف نہیں ہے۔ ہزاروں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے

گزرنے کے بعد آج بھی ان احادیث کے سینکڑوں حفاظ امت میں موجود ہیں تو اس ہادی کامل صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حفظ وحفاظت کا کیا عالم ہوگا۔ بہت سے صحابہ آپ کے ارشادات کو باقاعدہ لکھتے تھے اور اس سلسلے میں آپ کی اجازت کی بیسیوں روایات تاریخ الحدیث اور تدوین حدیث کی کتب میں موجود ہیں۔ خود تعامل امت ایک مستند ذریعہ ہے کہ جس کے باعث آپ کی مسنون زندگی کی ہر ادا اور ہر حکم کاملاً محفوظ ہوگیا ہے۔ یہ بات ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ آپ کی شخصیت واجب الاتباع اور واجب التقلید ہے۔ آپ کے طرز عمل کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ آپ کے ارشادات اور اعمال کو امت کے تنازعات کے رفع کرنے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ وَمَاآتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَانَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا (الحشر ۵۹: ۷) (جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ)۔ یوں ایک رسول اور شارع کی حیثیت سے قرآنی احکامات کی تشریح وتوضیح کی ذمہ داری آپ کے منصب نبوت کا ناگزیر تقاضا ہے جس کی تمام تر تفصیلات ذخیرۂ حدیث کے علاوہ کہیں اور دکھائی نہیں دیتیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں تو آپ کی شخصیت سراپا دعوت تھی اور صحابہ کی جملہ مشکلات اور مسائل کا حل براہِ راست ان کو میسر تھا۔ آپ کی حیات طیبہ میں جب قرآن مجید نے تکمیل دین کا اعلان کیا تو پھر آپ کی وفات کے بعد صحابہ نے اپنے تعامل کے علاوہ ان تمام روایات کو باہمی مذاکروں اور ضرورتوں کے مواقع پر دہرایا۔ ان روایات کی جمع وترتیب کے ساتھ ساتھ متن اور سند کے حوالے سے وہ علوم وفنون منصۂ شہود پر آئے۔ غیر جانبدارانہ نگاہ سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تاریخ نویسی میں کسی احتیاط کی فنی لحاظ سے جو انتہا اور کمال ہوسکتی ہے، علم حدیث میں اس سے بڑھ کر حزم واحتیاط کو اختیار کیا گیا، بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے تدوین حدیث کے عمل کو وہ سائنٹیفک اسلوب اور منہج عطا کیا کہ جس کے باعث یہ ذخیرۂ حدیث علوم انسانی کا سب سے بڑا اعزاز اور افتخار بن گیا۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی کامل تفصیلات کو

[illegible] بیان کیا ہے۔ [illegible] نگاروں اور سیرت نگاروں کے علاوہ محدثین نے روایات کے جمع کرنے میں اپنی عمریں کھپادیں اور پھر اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کے ذریعے سے ان روایات پر نقد کا ایسا سائنٹفک اسلوب وضع کیا کہ جس کے باعث ہر ایک روایت کی توثیق وتردید ہوتی گئی۔ ایک طرف راویوں کے سوانحی کوائف اور ان کے فضائل پر اسماء الرجال کے عنوان سے بیسیوں عظیم کتابیں مرتب ہوئیں تو دوسری طرف جرح وتعدیل کے وہ پیمانے وضع کیے گئے کہ جن کی روشنی میں کسی غلط اور موضوع روایت کا برقرار رہنا مشکل نہیں ناممکن بنا دیا گیا۔

نتائج بحث

۱- منکر حدیث حدیث کے ذخیرہ پر اپنے اعتراضات میں حق بجانب نہیں ہے۔

۲- جس طرح قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''وحی'' ہے اسی طرح حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ''وحی'' ہے۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ قرآن ''وحی متلو'' ہے اور حدیث ''وحی غیر متلو'' ہے۔

۳- رسول کی اطاعت دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے۔ کیونکہ رسول من جانب اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے۔

۴- قرآن فہمی حدیث کے بغیر ممکن نہیں۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی مبین اور مفسر ہے۔ حدیث کو حجت ماننا شرک فی الکتاب نہیں ہے۔

۵- احادیث کی حفاظت اور کتابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہی شروع ہوگئی تھی۔

۶- احادیث کا ذخیرہ معتبر ہے۔ علماء حدیث نے قبول حدیث کے لئے جو اصول ابتداء ہی سے مقرر کر دیئے تھے۔ ان کی موجودگی میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کسی جھوٹ نے مجموعہ ہائے حدیث میں اس طرح راہ پالی ہو کہ محدثین اس کی نشاندہی کرنے سے قاصر رہ گئے ہوں۔

۷- منکرین حدیث کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ کتب حدیث کا تقابلی مطالعہ انہیں حاصل نہیں۔ وہ احادیث کے بارے میں جو فیصلہ کرتے ہیں اپنے محدود مطالعہ کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ کبھی نہ کہتے کہ اکثر احادیث باہم متعارض ہیں۔ جن لوگوں کی احادیث کے پورے ذخیرہ پر نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ احادیث کے درمیان اتفاق بہت زیادہ اور اختلاف بہت کم ہے۔

۸- اجتہاد واستنباط کے لئے حدیث کی ضرورت ہے۔

حفاظت حدیث کے اہتمام سے انکار خود قرآن مجید کی حجیت اور قطعیت سے بالفعل اور بالعمل انکار ہے۔ مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ میں خود بھی دین کے اصول صحیح سے واقفیت حاصل کروں۔ ایم-اے علوم اسلامیہ کے اس مقالہ نے میرے لئے علم کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ تحقیق کے دوران مجھے اپنی کم علمی کا شدت سے احساس ہوا اور مزید تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ میری اس حقیر کاوش کو قبول فرمائے۔ آمین۔

راشدہ مبارک

فہرست آیات

38	230 : 4	فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا	22
39	23 : 4	وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ	23
40	23 : 4	وَرَبَائِبُكُمُ الّٰتِىْ	24
40	101 : 4	فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ	25
75	27 : 4	لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ	26
78	65 : 4	فَلَا وَرَبِّكَ لَايُؤْمِنُوْنَ	27
77	150 : 4	اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ	28
80	64 : 4	وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ	29
84	59 : 4	فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ	30
8	67 : 5	يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ	31
9	15 : 5	يٰاَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ	32
12	110 : 5	اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ	33
38	6 : 5	اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلَاةِ	34
39	3 : 5	حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ	35
11	83 : 6	اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا	36
101	23 : 6	وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَاكُنَّا	37
115	115 : 6	اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَماً	38
15	157 : 7	يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ	39
9	108 : 9	لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى	40
9	118 : 9	وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِيْنَ	41
100	81 : 9	قَالُوْا لَاتَنْفِرُوْا فِى الْحَرِّ	42
79	15 : 10	قُلْ مَايَكُوْنُ لِىْ اَنْ	43
115	111 : 12	مَاكَانَ حَدِيْثًا يُفْتَرٰى	44
101	92 : 15	فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ	45
9	64 : 16	وَمَآاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْكِتَابَ	46

48	وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ	31 : 17	37
49	فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ	6 : 18	3
50	اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ	125 : 19	11
51	فَلَا اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ	101 : 23	101
52	اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ	51 : 24	16
53	وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ	33 : 24	41
54	وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ	78 : 28	101
55	مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ	31 : 30	72
56	لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ	21 : 33	93
57	وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ	36 : 33	78
58	وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ	34 : 33	12
59	سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ	62 : 33	4
60	وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ	27 : 37	101
61	وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ	51 : 42	75
62	وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ	15 : 44	16
63	يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	33 : 47	17
64	فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖ	34 : 52	3
65	مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى	4 : 53	77
66	عَبَسَ وَتَوَلّٰى	6 : 53	38
67	حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ	5 : 54	11
68	وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ	7 : 59	78
69	وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ	3 : 66	75

فہرست احادیث

22	لا تكذبوا على فانه	جامع صحيح بخارى	[illegible]
23	رحل جابر بن عبدالله ميسرة	جامع صحيح بخارى	97
24	عن ابى هريره عن نبى انه قال اذا اشتد	جامع صحيح بخارى	100
25	فلما سمعوا الحديث اذ عنوا له ورجعو	جامع صحيح بخارى	110
26	انه لم يدفن نبى قط	جامع ترمذى	110

مصادر و مراجع

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	اشاعت
1	اسباب زوال امت	غلام احمد پرویز	طلوع اسلام کراچی 1956ء
2	اسد الغابۃ فی معرفت الصحابہ	ابن اثر	بیروت 1377ھ
3	اسلامی انسائیکلوپیڈیا	قاسم محمود	2000ء
4	اشاعت القرآن	مولوی عبداللہ چکڑالوی	1922ء
5	اشاعۃ السنۃ نمبر 5 جلد 19	ابو سعید محمد حسین	بٹالہ ضلع گورداسپور 1902ء
6	اظہار صداقت	زین العابدین	مدراس 1918ء
7	اعلام الموقعین (اردو ترجمہ)	شمس الدین ابن قیم الجوزیہ	اردو بازار لاہور جولائی 1999ء
8	اعلام الموقعین	ابن قیم جوزی	دہلی
9	القرآن الکریم		
10	المفردات فی غریب القرآن	ابی القاسم الحسن بن محمد المعروف بالراغب الاصفھانی	آرام باغ کراچی
11	انکار حدیث کے نتائج	محمد سرفراز خان صفدر	گوجرانوالہ 2004ء
12	ایک اسلام	ڈاکٹر غلام جیلانی برق	
13	آئینہ پرویزیت	مولانا عبدالرحمٰن گیلانی	لاہور 2001ء طبع سوم
14	تاریخ الخلفاء	امام حافظ الشیخ جلال الدین السیوطی	کان پور 1925ء
15	تدریب الراوی فی اصول الحدیث (اردو ترجمہ)	جلال الدین ابی بکر سیوطی	مصر 1307ھ
16	تدوین حدیث	سید مناظر احسن گیلانی	کراچی 1402ھ
17	تذکرہ جلد اول	محمد عنایت اللہ خان مشرقی	امرتسر 1924ء
18	تذکرۃ الحفاظ	الحافظ شمس الدین الذھبی	حیدرآباد دکن 1333ھ
19	ترجمان السنۃ جلد اول	مولانا محمد بدر عالم میرٹھی	1950ء ندوۃ المصنفین دہلی

21	تفہیمات	مولانا مودودی	لاہور 1951ء
22	تقریب التہذیب	ابن حجر عسقلانی	التوفی 852ھ قاہرہ
23	تیسر مصطلح الحدیث	ڈاکٹر محمود طحان	شارع شیش محل لاہور
24	جامع ترمذی	ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ	الریاض 1999ء
25	جامع صحیح بخاری	ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل	الریاض 1999ء طبع ثانی
26	جامع صحیح مسلم	ابوالحسن مسلم بن الحجاج القشیری	الریاض طبع ثالث 2000ء
27	حجیت حدیث	مولانا محمد ادریس کاندھلوی	لاہور طبع دوم
28	سلیم کے نام خطوط جلد اول	غلام احمد پرویز	طلوع اسلام لاہور 1958ء
29	سنت خیر الانام	صاحبزادہ محمد کرم شاہ	کراچی 1373ھ
30	سنن ابن ماجہ	ابوعبداللہ محمد بن یزید القزوینی ابن ماجہ	الریاض 1999ء
31	سنن ابی داؤد	سلیمان بن الاشعث السجستانی	الریاض 1999ء
32	سیرت النبی جلد چار	علامہ سید سلیمان ندوی	نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد
33	صحیح مقام حدیث جلد اول	فضل احمد غزنوی	حیدرآباد سندھ 1955ء
34	طبقات ابن سعد	محمد بن سعید	نفیس اکیڈمی کراچی
35	عظمت حدیث	مولانا عبدالغفار حسن رحمانی	اسلام آباد 1989ء
36	علوم الحدیث	ڈاکٹر صبحی صالح ترجمہ غلام احمد حریری	کارخانہ بازار لائلپور پاکستان
37	فتح الباری	احمد بن علی بن حجر العسقلانی بن کثیر	وفات 854ھ
38	فتنہ انکار حدیث	حافظ محمد ایوب دہلوی	کراچی 1957ء
39	فتنہ پرویز وحقیقت حدیث	ایم عبدالرحمٰن خان	
40	قرآنی فیصلے جلد دوم	طلوع اسلام ٹرسٹ	لاہور دوسرا ایڈیشن 1964ء
41	کتاب الرسالہ	محمد بن ادریس شافعی	کراچی 1968ء
42	لسان العرب	علامہ ابن منظور	بیروت 1988ء
43	مشکاۃ المصابیح	ولی الدین خطیب تبریزی	بیروت طبع ثالث 1985ء
44	مشکاۃ المصابیح	ولی الدین خطیب تبریزی	مکتبہ رحمانیہ لاہور

46	معراج انسانیت	غلام احمد پرویز	فکشن ہاؤس لاہور 1968ء
47	مقدمۃ المیزان شعرانی (اردو ترجمہ)		لاہور
48	من ویزداں	علامہ نیاز فتح پوری	لاہور
49	مؤطا امام مالک	مالک بن انس	اردو بازار لاہور 1983ء
50	نظام ربوبیت	غلام احمد پرویز	طلوع اسلام کراچی 1956ء